ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد۲۰ شمارہ ۹ ستمبر ۲۰۰۸ شعبان/رمضان ۱۴۲۹

جاوید احمد غامدی

روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسرا فرض روزہ ہے۔ یہ روزہ کیا ہے؟ انسان کے نفس پر جب اس کی خواہشیں غلبہ پا لیتی ہیں تو وہ اپنے پروردگار سے غافل اور اس کے حدود سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی غفلت اور بے پروائی کی اصلاح کے لیے ہم پر روزہ فرض کیا ہے۔ یہ عبادت سال میں ایک مرتبہ پورے ایک مہینے تک کی جاتی ہے۔ رمضان آتا ہے تو صبح سے شام تک ہمارے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ خلوت کرنے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس نے یہ عبادت ہم سے پہلی امتوں پر بھی اسی طرح فرض کی تھی جس طرح ہم پر فرض کی ہے۔ ان امتوں کے لیے، البتہ اس کی شرطیں ذرا سخت تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے جس طرح دوسری سب چیزوں کو ہلکا کیا، اسی طرح اس عبادت کو بھی بالکل معتدل بنا دیا ہے۔ تاہم دوسری سب عبادتوں کے مقابلے میں یہ اس لیے ذرا بھاری ہے کہ اس کا مقصد ہی نفس کے منہ زور رجحانات کو لگام دے کر ان کا رخ صحیح سمت میں موڑنا اور اسے حدود کا پابند بنا دینا ہے۔ یہ چیز، ظاہر ہے کہ تربیت میں ذرا سختی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

سحری کے وقت ہم کھا پی رہے ہوتے ہیں کہ یکایک اذان ہوتی ہے اور ہم فوراً ہاتھ روک لیتے ہیں۔ اب خواہشیں کیسا ہی زور لگائیں، دل کیسا ہی مچلے، طبیعت کیسی ہی ضد کرے، ہم ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن سے روزے کے دوران میں ہمیں روک دیا گیا ہے۔ یہ ساری رکاوٹ اس وقت تک رہتی ہے، جب تک مغرب کی اذان نہیں ہوتی۔ روزہ ختم کر دینے کے لیے ہمارے رب نے یہی وقت مقرر کیا ہے۔ چنانچہ مغرب کے وقت موذن جیسے ہی بولتا ہے، ہم فوراً افطار کے لیے لپکتے ہیں۔ اب رات بھر ہم پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ رمضان کا پورا مہینا ہم اسی طرح گزارتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وقتی طور پر اگرچہ کچھ کمزوری اور کام کرنے کی صلاحیت میں کمی تو محسوس کرتے ہیں، لیکن اس سے صبر اور تقویٰ کی وہ نعمت ہم کو حاصل ہوتی ہے جو اس زمین پر اللہ کا بندہ بن کر

رہنے کے لیے ہماری روح کی اسی طرح ضرورت ہے، جس طرح ہوا اور پانی اور غذا ہمارے جسم کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ آدمی صرف روٹی ہی سے نہیں جیتا، بلکہ اس بات سے جیتا ہے جو اس کے رب کی طرف سے آتی ہے۔

یہ روزہ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض ہے، لیکن وہ اگر مرض یا سفر یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر رمضان میں یہ فرض پورا نہ کر سکے تو جتنے روزے چھوٹ جائیں، ان کے بارے میں اجازت ہے کہ وہ رمضان کے بعد کسی وقت رکھ لیے جائیں۔ روزوں کی تعداد ہر حال میں پوری ہونی چاہیے۔

اس روزے سے ہم بہت کچھ پاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اس سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ ہماری روح خواہشوں کے زور سے نکل کر علم و عقل کی ان بلندیوں کی طرف پرواز کے قابل ہو جاتی ہے، جہاں آدمی دنیا کی مادی چیزوں سے برتر اپنے رب کی بادشاہی میں جیتا ہے۔

اس مقصد کے لیے روزہ ان سب چیزوں پر پابندی لگاتا ہے جن سے خواہشیں بڑھتی ہیں اور لذتوں کی طرف میلان میں اضافہ ہوتا ہے۔ بندہ جب یہ پابندی جھیلتا ہے تو اس کے نتیجے میں زہد و فقیری کی جو حالت اس پر طاری ہو جاتی ہے، اس سے وہ دنیا سے ٹوٹتا اور اپنے رب سے جڑتا ہے۔ روزے کا یہی پہلو ہے جس کی بنا پر اللہ نے فرمایا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا بھی میں اپنے ہاتھ سے دوں گا، اور فرمایا کہ روزے دار کے منہ کی بو مجھے مشک کی خوش بو سے زیادہ پسند ہے۔

ہر اچھے کام کا اجر سات سو گنا ہو سکتا ہے، لیکن روزہ اس سے بھی آگے ہے۔ اس کی جزا کیا ہو گی؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ جب بدلے کا دن آئے گا تو وہ یہ بھید کھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزے دار کو اس کے عمل کا صلہ دے گا۔ پھر کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین کا مالک جب اپنے ہاتھ سے صلہ دے گا تو اس کا بندہ کس طرح نہال ہو جائے گا۔

دوسری چیز اس سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان کے وجود میں فتنے کے دروازے بڑی حد تک بند ہو جاتے ہیں۔ یہ زبان اور شرم گاہ، یہی دونوں وہ جگہیں ہیں جہاں سے شیطان بالعموم انسان پر حملہ کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھے ان دو چیزوں کے بارے میں ضمانت دے گا جو اس کے دونوں گالوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان ہیں، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ روزہ ان دونوں پر پہرا بٹھا دیتا ہے اور صرف کھانا پینا ہی نہیں، زبان اور شرم گاہ میں حد سے بڑھنے کے جتنے میلانات ہیں، ان سب کو کمزور کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کے لیے

وہ کام بہت آسان ہو جاتے ہیں جن سے اللہ کی رضا اور جنت مل سکتی اور ان کاموں کے راستے اس کے لیے بڑی حد تک بند ہو جاتے ہیں جن سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے وہ دوزخ میں جائے گا۔ یہی حقیقت ہے جسے اللہ کے نبی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ روزوں کے مہینے میں شیطان کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔

تیسری چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان کا اصلی شرف، یعنی ارادے کی قوت اس کی شخصیت میں نمایاں ہو جاتی ہے اور اس طریقے پر تربیت پا لیتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے اپنی طبیعت میں پیدا ہونے والے ہر ہیجان کو اس کے حدود میں رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ارادے کی یہ قوت اگر کسی شخص میں کمزور ہو تو وہ نہ اپنی خواہشوں کو بے لگام ہونے سے بچا سکتا ہے، نہ اللہ کی شریعت پر قائم رہ سکتا ہے اور نہ طمع، اشتعال، نفرت اور محبت جیسے جذبوں کو اعتدال پر قائم رکھ سکتا ہے۔ یہ سب چیزیں انسان سے صبر چاہتی ہیں اور صبر کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان میں ارادے کی قوت ہو۔ روزہ اس قوت کو بڑھاتا اور اس کی تربیت کرتا ہے۔ پھر یہی قوت انسان کو برائی کے مقابلے میں اچھائی پر قائم رہنے میں مدد دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی نے روزے کو ڈھال کہا اور انسان کو بتایا کہ وہ برائی کی ہر ترغیب کے سامنے یہ ڈھال اس طرح استعمال کرے کہ جہاں کوئی شخص اسے برائی پر ابھارے، وہ اس کے جواب میں یہ کہہ دے کہ میں تو روزے سے ہوں۔

چوتھی چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ انسان میں ایثار کا جذبہ ابھرتا ہے اور اسے دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے اور ان کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ روزے میں آدمی کو بھوک اور پیاس کا جو تجربہ ہوتا ہے، وہ اسے غریبوں کے قریب کر دیتا ہے اور ان کی ضرورتوں کا صحیح احساس اس میں پیدا کرتا ہے۔ روزے کا یہ اثر، بے شک کسی پر کم پڑتا ہے اور کسی پر زیادہ، لیکن ہر شخص کی صلاحیت اور اس کی طبیعت کی سلامتی کے لحاظ سے پڑتا ضرور ہے۔ وہ لوگ جو اس اعتبار سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، ان کے اندر تو گویا دریا امنڈ پڑتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ آپ یوں تو ہر حال میں بے حد فیاض تھے، مگر رمضان میں تو بس جود و کرم کے بادل بن جاتے اور اس طرح برستے کہ ہر طرف جل تھل ہو جاتا تھا۔

پانچویں چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ رمضان کے مہینے میں روزے دار کو جو خلوت اور خاموشی اور دوسروں سے کسی حد تک الگ تھلگ ہو جانے کا موقع ملتا ہے، اس میں قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے معنی کو سمجھنے کی طرف بھی طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ کتاب اسی ماہ رمضان میں اتاری اور اسی نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس کو روزوں کا مہینا بنا دیا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل علیہ السلام بھی اسی مہینے میں قرآن سننے اور سنانے کے

لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔ روزے سے قرآن مجید کی یہی مناسبت ہے جس کی بنا پر امت کے اکابر اس مہینے میں اپنے نبی کی پیروی میں رات کے پچھلے پہر اور عام لوگ انھی کی اجازت سے عشا کے بعد نفلوں میں اللہ کا کلام سنتے اور سناتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی راتوں میں نماز کے لیے کھڑا رہا، اس کا یہ عمل اس کے پچھلے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جائے گا۔

چھٹی چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اگر چاہے تو اس مہینے میں بہت آسانی کے ساتھ اپنے پورے دل اور پوری جان کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے بندے اگر یہ چیز آخری درجے میں حاصل کرنا چاہیں تو اس کے لیے اسی رمضان میں اعتکاف کا طریقہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اگرچہ ہر شخص کے لیے ضروری نہیں ہے، لیکن دل کو اللہ کی طرف لگانے کے لیے یہ بڑی اہم عبادت ہے۔ اعتکاف کے معنی ہمارے دین میں یہ ہیں کہ آدمی دس دن یا اپنی سہولت کے مطابق اس سے کم کچھ دنوں کے لیے سب سے الگ ہو کر اپنے رب سے لو لگا کر مسجد میں بیٹھ جائے اور اس عرصے میں کسی ناگزیر ضرورت ہی کے لیے وہاں سے نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اکثر اس کا اہتمام فرماتے تھے اور خاص طور پر اس ماہ کے آخری دس دنوں میں رات کو خود بھی زیادہ جاگتے، اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور پوری مستعدی کے ساتھ اللہ کی عبادت میں لگے رہتے تھے۔

یہ سب چیزیں روزے سے حاصل ہو سکتی ہیں، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ روزے داران خرابیوں سے بچیں جو اگر روزے میں در آئیں تو اس کی ساری برکتیں بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ خرابیاں اگرچہ بہت سی ہیں، لیکن ان میں بعض ایسی ہیں کہ ہر روزے دار کو ان کے بارے میں ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے۔

ان میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ لوگ رمضان کو لذتوں اور چٹخاروں کا مہینا بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس مہینے میں جو بھی خرچ کیا جائے، اس کا اللہ کے ہاں کوئی حساب نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح کے لوگ اگر کچھ کھاتے پیتے بھی ہوں تو ان کے لیے تو پھر یہ مزے اڑانے اور بہار لوٹنے کا مہینا ہے۔ وہ اس کو نفس کی تربیت کے بجائے اس کی پرورش کا مہینا بنا لیتے ہیں اور ہر روز افطار کی تیاریوں ہی میں صبح کو شام کرتے ہیں۔ وہ جتنا وقت روزے سے ہوتے ہیں، یہی سوچتے ہیں کہ سارے دن کی بھوک پیاس سے جو خلا ان کے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اسے وہ اب کن کن نعمتوں سے بھریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو روزے سے وہ کچھ پاتے ہی نہیں اور اگر کچھ پاتے ہیں تو اسے وہیں کھو دیتے ہیں۔

اس خرابی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کام کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن

اس کو جینے کا مقصد نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی اہتمام کے مل جائے، اس کو اللہ کا شکر کرتے ہوئے کھا لے۔ گھر والے جو کچھ دستر خوان پر رکھ دیں، وہ اگر دل کو نہ بھی بھائے تو اس پر خفا نہ ہو۔ اللہ نے اگر مال و دولت سے نوازا ہے تو اپنے نفس کو پالنے کے بجائے، اسے غریبوں اور فقیروں کی مدد اور ان کے کھلانے پلانے پر خرچ کرے۔ یہ چیز یقیناً اس کے روزے کی برکتوں کو بڑھائے گی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی نے رمضان میں اس عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجائے، اسے بھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں اور بعض حالتوں میں اپنے زیر دستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اس کا علاج اللہ کے نبی نے یہ بتایا ہے کہ آدمی اس طرح کے سب موقعوں پر روزے کو اس اشتعال کا بہانہ بنانے کے بجائے اس کے مقابلے میں ایک ڈھال کی طرح استعمال کرے، اور جہاں اشتعال کا کوئی موقع پیدا ہو، فوراً یاد کرے کہ میں روزے سے ہوں۔ وہ اگر غصے اور اشتعال کے ہر موقع پر یاددہانی کا یہ طریقہ اختیار کرے گا تو آہستہ آہستہ دیکھے گا کہ بڑی سے بڑی ناگوار باتیں بھی اب اسے گوارا ہیں۔ وہ محسوس کرے گا کہ اس نے اپنے نفس کے شیطان پر اتنا قابو پا لیا ہے کہ وہ اب اسے گرا لینے میں کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں فتح کا یہ احساس اس کے دل میں اطمینان اور برتری کا احساس پیدا کرتا ہے اور روزے کی یہی یاددہانی اس کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ پھر وہ وہیں غصہ کرتا ہے، جہاں اس کا موقع ہوتا ہے۔ وقت بے وقت اسے مشتعل کر دینا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ بہت سے لوگ جب روزے میں کھانے پینے اور اس طرح کی دوسری دل چسپیوں کو چھوڑتے ہیں تو اپنی اس محرومی کا مداوا ان دل چسپیوں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن سے ان کے خیال میں روزے کو کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہل جاتا ہے۔ وہ روزہ رکھ کر تاش کھیلیں گے، ناول اور افسانے پڑھیں گے، نغمے اور غزلیں سنیں گے، فلمیں دیکھیں گے، دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکیں گے اور اگر یہ سب نہ کریں گے تو کسی کی غیبت اور ہجو ہی میں لپٹ جائیں گے۔ روزے میں پیٹ خالی ہو تو آدمی کو اپنے بھائیوں کا گوشت کھانے میں ویسے بھی بڑی لذت ملتی

ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات صبح اس مشغلے میں پڑتے ہیں اور پھر موذن کی اذان کے ساتھ ہی اس سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔

اس خرابی کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کا ادب سمجھے اور زیادہ سے زیادہ یہی کوشش کرے کہ اس کی زبان پر کم سے کم اس مہینے میں تو تالا لگا رہے۔ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ آدمی اگر ہر قسم کی جھوٹی سچی باتیں زبان سے نکالتا ہے تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ جو وقت ضروری کاموں سے بچے، اس میں آدمی قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے اور دین کو سمجھے۔ وہ روزے کی اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر اس میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعاؤں کا کچھ حصہ یاد کر لے۔ اس طرح وہ اس وقت ان مشغلوں سے بچے گا اور بعد میں یہی ذخیرہ اللہ کی یاد کو اس کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اس کے کام آئے گا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات روزہ اللہ کے لیے نہیں، بلکہ اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کی ملامت سے بچنے کے لیے رکھتا ہے اور کبھی لوگوں میں اپنی دین داری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے یہ مشقت جھیلتا ہے۔ یہ چیز بھی روزے کو روزہ نہیں رہنے دیتی۔

اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی روزے کی اہمیت ہمیشہ اپنے نفس کے سامنے واضح کرتا رہے اور اسے تلقین کرے کہ جب کھانا پینا اور دوسری لذتیں چھوڑ ہی رہے ہو تو پھر انھیں اللہ کے لیے کیوں نہیں چھوڑتے۔ اس کے ساتھ رمضان کے علاوہ کبھی کبھی نفلی روزے بھی رکھے اور انھیں زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرے۔ اس سے امید ہے کہ اس کے یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں گے۔

[۱۹۸۸ء]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ، وَطَعَامُکُمۡ

تمام پاکیزہ چیزیں اب تمھارے لیے حلال ٹھیرا دی گئی ہیں۔[28] (چنانچہ) اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے۔[29] (اِسی طرح شرک و توحید کے حدود بھی واضح ہو

[۲۸] یعنی خبائث میں سے جن چیزوں کے بارے میں کوئی شبہ ہو سکتا تھا، اُسے پوری طرح دور کر دینے کے بعد اب تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کر دی گئی ہیں اور وہ تمام پابندیاں ختم ہو گئی ہیں جو یہود نے یا تو از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھیں یا اُن کی ضد، ہٹ دھرمی اور سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُن پر لگا دی تھیں۔

[۲۹] مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام اور خبیث و طیب کے ہر لحاظ سے واضح ہو جانے کے بعد اب کوئی اندیشہ نہیں رہا کہ تم کسی حرام اور خبیث چیز سے آلودہ ہو سکتے ہو، اِس لیے طیبات تمھارے دستر خوان پر ہوں یا اہل کتاب کے، دونوں کے لیے جائز ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو ایک دوسرے کا ذبیحہ بھی تمھارے لیے جائز ہے۔ اہل کتاب اِسے نہ مانیں تو یہ اُن کی بدقسمتی ہے۔ تمھارے پروردگار نے تو جو وعدہ اُن سے کیا تھا، وہ تمھارا کھانا اُن کے لیے جائز کر کے پورا کر دیا ہے اور خور و نوش کے معاملے میں وہ تمام پابندیاں اٹھا لی ہیں جو اُن کی سرکشی کے باعث اُن پر عائد کی گئی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اُنھوں نے اِس کی قدر نہیں کی تو یہ اُن کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اُن کی نالائقی کی وجہ سے آخر خدا اپنے

حِلٌّ لَّھُمْ، وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ، اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ، وَ لَا مُتَّخِذِیْٓ

گئے ہیں، لہٰذا) مسلمانوں کی پاک دامن عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں اور تم سے پہلے کے اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں[۳۰]، جب تم اُن کے مہر اُنھیں ادا کر دیتے ہو، اِس شرط کے ساتھ کہ تم بھی پاک دامن رہنے والے ہو نہ بدکاری کرنے والے اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے۔ (اپنے

وعدے کو کیوں فراموش کرتا؟ سورج چمکتا ہے، خواہ کوئی اپنی آنکھیں بند رکھے یا کھلی رکھے۔ نسیم صبح اپنی عطر بیزیوں سے ہر مشام جان کو معطر کرنا چاہتی ہے اور اُس کے فیض عام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر ایک کو فیض یاب کرے، لیکن جو محروم القسمت اپنی ناک اور اپنے منہ بند کر لیتے ہیں، وہ اُس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اِسی طرح رب کریم نے جو سفرۂ نعمت اِس امت کے ذریعے سے تمام دنیا کے آگے بچھانا چاہا تھا، وہ بچھا دیا اور اُس سے متمتع ہونے کی دعوت اہل کتاب کو بھی دے دی۔ اُنھوں نے اِس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ اُن کی اپنی بدقسمتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۶۴)

[۳۰] سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمان نہ مشرک عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور نہ اپنی عورتیں مشرکین کے نکاح میں دے سکتے ہیں۔ یہ حکم جس طرح مشرکین عرب سے متعلق تھا، اِسی طرح اشتراک علت کی بنا پر یہود و نصاریٰ سے بھی متعلق ہو سکتا تھا، کیونکہ علم و عمل، دونوں میں وہ بھی شرک جیسی نجاست سے پوری طرح آلودہ تھے۔ تاہم اصلاً چونکہ توحید ہی کے ماننے والے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے رعایت فرمائی اور اُن کی پاک دامن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دے دی ہے۔ آیت کے سیاق سے واضح ہے کہ یہ اجازت اُس وقت دی گئی، جب حلال و حرام اور شرک و توحید کے معاملے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ اِس کے لیے آیت کے شروع میں لفظ 'الیوم' کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس اجازت میں شرک و توحید کے وضوح اور شرک پر توحید کے غلبے کو بھی یقیناً دخل تھا۔ لہٰذا اِس بات کی پوری توقع تھی کہ مسلمان اِن عورتوں سے نکاح کریں گے تو یہ اُن سے لازماً متاثر ہوں گی اور شرک و توحید کے مابین کوئی تصادم نہ صرف یہ کہ پیدا نہیں ہو گا، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اُن میں بہت سی ایمان و اسلام سے مشرف ہو جائیں۔ یہ چیز اِس اجازت سے فائدہ اٹھاتے وقت اِس زمانے میں بھی ملحوظ رہنی چاہیے۔

اَخۡـدَانٍ، وَمَـنۡ يَّـكۡـفُـرۡ بِـالۡاِيۡـمَـانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُهٗ، وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۵﴾

ایمان کو، البتہ ہر حال میں خالص رکھو) اور (جانتے رہو کہ) جو ایمان کے منکر ہیں[۳۱]، اُن کی سب محنت ضائع ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ نامرادوں میں سے ہوں گے۔ ۵

---

[۳۱] یعنی ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے اپنے علم و عمل میں کفر و شرک اختیار کرتے یا اُن کے ساتھ مصالحت روا رکھتے ہیں۔

[باقی]

طالب محسن

اذان اور اقامت

عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: أُمِرَ بِلَالٌ أَنْ یَّشْفَعَ الْأَذَانَ وَیُوتِرَ الْإِقَامَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان (میں کلمات) دہرائیں اور اقامت میں اکہرے رکھیں۔

زَادَ یَحْیٰی فِی حَدِیْثِہِ عَنِ ابْنِ عُلَیَّةَ فَحَدَّثْتُ بِہِ أَیُّوبَ، فَقَالَ: إِلَّا الْإِقَامَةَ.

(امام مسلم کے شیخ) یحییٰ بن یحییٰ ابن علیہ سے اپنی روایت میں ابن علیہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے جب یہ روایت اپنے شیخ ایوب کے سامنے بیان کی تو انھوں نے کہا: سوائے اقامت[1] کے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: ذَكَرُوا أَنْ يُعْلِمُوا وَقْتَ الصَّلٰوةِ بِشَیْءٍ يَعْرِفُونَهُ. فَذَكَرُوا أَنْ يُّنَوِّرُوا نَارًا أَوْ يَضْرِبُوا نَاقُوسًا. فَأُمِرَ بِلَالٌ أَنْ يَّشْفَعَ

[1] ہمارے نزدیک یہ جملہ روایت کا حصہ نہیں ہے۔ یہ اصلاً ایوب رحمہ اللہ کی وضاحت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ''اقامت اکہری کہو'' سے مراد یہ نہیں ہے کہ 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ' کا جملہ بھی اکہرا ہوگا۔

الْأَذَانَ وَيُوتِرَ الْإِقَامَةَ.

حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ (لوگوں) نے بات کی کہ وہ کسی ایسی چیز کو نماز کے وقت سے آگاہ کرنے کے لیے اختیار کریں جسے سب پہچانتے ہوں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ آگ جلائیں یا ناقوس بجائیں۔ چنانچہ حضرت بلال کو حکم دیا گیا کہ اذان دہری کہیں اور اقامت اکہری کہیں۔

حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ ابْنُ حَاتِمٍ. حَدَّثَنَا بَهْزٌ. حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ. حَدَّثَنَا خَالِدٌ الْحَذَّاءُ بِهٰذَا الْإِسْنَادِ لَمَّا كَثُرَ النَّاسُ ذَكَرُوا أَنْ يُّعْلِمُوا بِمِثْلِ حَدِيثِ الثَّقَفِيِّ غَيْرَ أَنَّهُ قَالَ أَنْ يُّورُوا نَارًا.

مجھے بتایا محمد بن حاتم نے۔ ہمیں بتایا بہز نے۔ ہمیں بتایا اسی سند سے خالد الحذّاء نے کہ جب لوگ زیادہ ہو گئے تو انھوں نے کہا کہ وہ آگاہ کریں، (آگے) متن ثقفی کی حدیث کے مانند ہے۔ سوائے اس کے کہ اس نے ('يُنَوِّرُوا نَارًا' کے بجائے) 'يُورُوا نَارًا'[۲] کہا۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ أُمِرَ بِلَالٌ أَنْ يَّشْفَعَ الْأَذَانَ وَيُوتِرَ الْإِقَامَةَ.

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ بلال سے کہا گیا کہ وہ اذان دہری کہیں اور اقامت اکہری کہیں۔

۲؎ ''آگ روشن کرو''، یہاں 'نَوَّرَ' کے بجائے 'اَوْرٰی' کا فعل استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب صاحب ''مصباح اللغات'' نے چقماق سے آگ نکالنا لکھا ہے۔

لغوی مباحث

’یُشْفَعَ الْأَذَانَ وَیُوْتِرَ الْاِقَامَۃَ‘: ’شَفَعَ‘ کا فعل تائید کرنے، دہرا کرنے اور جفت بنانے کے معنی میں آتا ہے۔ سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ یہاں تیسرے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح ’وتر‘ کا لفظ طاق کرنے کے معنی میں بھی معروف ہے، لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اذان کے سارے کلمے دو دو بار کہے جاتے ہیں، لیکن ’اَللّٰہُ اَکْبَرُ‘ کا کلمہ چار بار کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اقامت میں بھی ’قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ‘ کا جملہ دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں ’شفع‘ اور ’وتر‘ کے الفاظ علی سبیل التغلیب استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا منطقی اطلاق درست نہیں ہے۔ بعض فقہی اختلافات ان الفاظ کے منطقی اطلاق سے پیدا ہوئے ہیں۔

معنی

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان اور اقامت میں فرق ہے۔ اس حوالے سے اختلافات کا خلاصہ ابن رشد نے ’’بدایۃ المجتہد‘‘ میں ان الفاظ میں کیا ہے:

’’علما نے اذان کے طریقے میں اختلاف کیا ہے اور اس کی چار مشہور صورتیں بیان کی ہیں: ایک اذان میں تکبیر کا دو بار، شہادتین کا چار بار اور باقی کلمات کا دو بار ہونا۔ یہ اہل مدینہ، یعنی مالک وغیرہ کا مذہب ہے۔ متأخرین اصحاب مالک نے ترجیع کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ ترجیع سے مراد شہادتین کو پہلے ہلکی آواز سے دو مرتبہ کہنا اور پھر بلند آواز سے دو مرتبہ کہنا ہے۔

دوسری اہل مکہ کی اذان ہے۔ امام شافعی کی رائے یہی ہے، اس میں پہلے تکبیر چار بار، پھر شہادتین اور باقی اذان کا دو بار ہونا۔

تیسری کوفیوں کی اذان ہے، اس میں پہلی تکبیر کا چار بار ہونا اور باقی اذان کا دو بار ہونا ہے۔ ابوحنیفہ کی یہی رائے ہے۔

چوتھی اذان بصریوں کی ہے۔ اس میں پہلی تکبیر چار بار ہے، شہادتین تین بار ہیں اور ’حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ‘ اور ’حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ‘۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ’اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ‘ سے لے کر ’حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ‘ تک ہر جملہ ایک ایک مرتبہ پڑھا جاتا ہے، پھر اسی طرح دوبارہ پڑھا جاتا ہے اور پھر اسی طرح تیسری بار پڑھا جاتا ہے۔ یہ حسن بصری اور ابن سیرین کی رائے ہے۔

ان چاروں کے اختلاف کی وجہ روایات اور جاری عمل میں اختلاف ہے۔ اہل مدینہ اپنے ہاں جاری عمل سے استشہاد کرتے ہیں۔ اہل مکہ اپنے ہاں جاری عمل سے اور اہل کوفہ اور اہل بصرہ اپنے علاقے کے عمل سے استشہاد کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس کچھ آثار بھی ہیں جن کو یہ اپنی رائے کے حق میں پیش کرتے ہیں۔''

(۷۶-۷۷)

اسی طرح اقامت کے حوالے سے ابن رشد نے لکھا ہے:

''اقامت کا طریقہ مالک اور شافعی کے نزدیک پہلی تکبیر دو بار ہے۔ باقی سارے کلمات ایک ایک بار ہیں۔ 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ' کے بارے میں امام مالک ایک بار اور امام شافعی دو بار کہنے کے قائل ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک اقامت دو دو ہے۔ احمد بن حنبل نے ایک ایک یا دو دو بار کہنے میں تخییر کی رائے دی ہے۔ ان کے نزدیک اس معاملے میں تخییر ہی رکھی گئی ہے۔

اس اختلاف کی وجہ حدیث انس اور حدیث ابولیلیٰ کا تعارض ہے۔ حدیث انس میں بلال کو اذان کے دہرا ہونے اور اقامت کے 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ' کے استثنا کے ساتھ اکہرا ہونے کا بیان ہے، جبکہ حدیث ابی لیلیٰ میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال کو حکم دیا تو انھوں نے اذان بھی دہری دی اور اقامت بھی دہری کہی۔''

(بدایۃ المجتہد ۸۰)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ روایات بھی مختلف ہیں اور مختلف علاقوں میں تدوین فقہ کے زمانے میں جو عمل جاری تھا، وہ بھی مختلف تھا۔ حنفی شارحین میں سے بعض نے اقامت کے اکہرے کہنے کے حکم کو اذان کے مقابلے میں اقامت کے پڑھنے میں کم لمبا کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک اذان کی طرح اقامت میں بھی کلمات کا دو دو بار پڑھا جانا ہی اصل صورت ہے اور جاری کردہ طریقہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ اختلاف محض روایت کی وجہ سے ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ اذان اور اقامت روز پانچ مرتبہ کہی جاتی ہے۔ اس لیے اس کے طریقے کے معلوم ومشہود ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کئی سال اذان واقامت کا جاری رہنا اور بعد میں خلافت راشدہ کا مدینہ میں ربع صدی کا عرصہ اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری کردہ عمل اور طریقے کے مطابق ان امور کا جاری رہنا کم ازکم ان علاقوں میں اذان واقامت کی ہیئت کو گم نہیں ہونے دے سکتا جو خلافت راشدہ اور صحابہ کے براہ راست زیر نگیں رہے، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ ابتدائی فقہا ہی مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں کے موجود ہونے کو بیان کر رہے ہیں۔ روایات کا اختلاف عمل کے مختلف ہونے کا باعث بھی ہوسکتا ہے اور عمل کے مختلف ہونے کا نتیجہ بھی۔ چنانچہ روایات

اختلاف کے پیدا ہونے کے سبب کے تعین میں زیادہ مدد نہیں دے سکتیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں اس معاملے میں وسعت رکھی گئی تھی۔ اگر مسلم کی زیر بحث روایت کو اس معاملے میں اصل مان لیا جائے تو اقامت میں کلمات دہرانا یا ترجیع کا طریقہ تطوع کے حکم میں ہوگا۔ استاد محترم نے اپنی کتاب ''میزان'' کے باب ''قانون عبادات'' میں اذان اور اقامت کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''قیام جماعت کے لیے شریعت کا متعین کردہ طریقہ درج ذیل ہے:

۱۔ نماز سے پہلے اذان دی جائے گی تاکہ لوگ اِسے سن کر جماعت میں شامل ہو سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے جو کلمات مقرر فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ؛ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ؛ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ؛ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ؛ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ؛ اَللّٰہُ اَکْبَرُ؛ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ....

۲۔ ایک ہی مقتدی ہو تو وہ امام کے دائیں جانب اُس کے ساتھ کھڑا ہوگا اور زیادہ ہوں تو امام درمیان میں ہوگا اور وہ اُس کے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔

۳۔ نماز کھڑی کرنے کے لیے اقامت کہی جائے گی۔ اُس میں اذان ہی کے الفاظ دہرائے جائیں گے۔ اتنا فرق، البتہ ہوگا کہ 'حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ' کے بعد اقامت کہنے والا 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ' (نماز کھڑی ہوگئی ہے) بھی کہے گا۔

۴۔ اذان کے کلمات پیش نظر مقصد کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ دہرائے جائیں گے۔'' (۳۱۷)

اسی سلسلے میں آگے اذان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانۂ رسالت میں اذان کے کلمات بالعموم دو دو مرتبہ کہے جاتے تھے۔'' (۳۱۷)

اقامت کے حوالے سے لکھا ہے:

''اقامت بالعموم اکہری کہی جاتی تھی۔'' (۳۱۹)

زیادہ قرائن اسی کے حق میں ہیں کہ اذان میں پہلی بار 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' چار بار اور باقی کلمات دو دو بار کہے جائیں۔ اسی طرح اقامت میں 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' اور 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ' دو دو بار اور باقی کلمات ایک ایک بار کہے جائیں۔

متون

امام مسلم کا منتخب کردہ یہ متن اذان و اقامت کے حوالے سے مروی بیانات میں سے مختصر ترین ہے۔ امام مسلم نے وہ متن بھی دے دیے ہیں جن سے انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ یہ جملہ کس سیاق وسباق میں کہا گیا تھا۔ ہم پچھلی روایت کے تحت متون کی وضاحت میں متعلقہ اہم متون درج کر چکے ہیں اور اس صورت حال کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کر دیا ہے۔ لہٰذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

کتابیات

موطا، رقم ۱۴۷؛ بخاری، رقم ۵۷۸- ۵۷۹، ۵۸۱، ۳۲۷۰؛ مسلم، رقم ۳۷۷-۳۷۸؛ ابوداؤد، رقم ۴۹۸-۵۱۲؛ نسائی، رقم ۶۲۶؛ ترمذی، رقم ۱۹۰؛ ابن ماجہ، رقم ۷۰۶-۷۰۷، ۷۲۹؛ احمد، رقم ۶۳۵۷، ۱۶۵۲۴-۱۶۵۲۵، ۲۲۱۷۷؛ ابن حبان، رقم ۱۶۷۸؛ ابن خزیمہ، رقم ۳۶۱، ۳۶۷-۳۶۸؛ حاکم، رقم ۴۷۹۷-۴۷۹۸؛ دارمی، رقم ۱۱۸۷؛ بیہقی، رقم ۱۷۰۱-۱۷۰۲، ۱۷۸۳، ۱۸۰۴؛ عبدالرزاق، رقم ۱۷۷۶۔

محمد رفیع مفتی

بتوں کی قسم کھانے اور جوئے کی دعوت دینے والے کے لیے حکم

رُوِیَ[۱] عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَلَفَ مِنْکُمْ فَقَالَ فِیْ حَلْفِہِ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی فَلْیَقُلْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَمَنْ قَالَ لِصَاحِبِہِ تَعَالَ أُقَامِرْکَ فَلْیَتَصَدَّقْ بِشَیْءٍ[۲].

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ تم میں سے جس نے قسم کھاتے ہوئے کہا: ’لات اور عزیٰ کی قسم‘ تو اسے چاہیے کہ وہ ’لا الٰہ الا اللہ‘ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں) کہے[۱] اور جس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آؤ، جوا کھیلیں تو اسے چاہیے کہ وہ کچھ نہ کچھ صدقہ دے[۲]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ غیر اللہ کی قسم کھانا شرکیہ اعمال میں سے ہے۔ چنانچہ کسی مسلمان کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ غیر اللہ کی قسم کھائے۔ لات وعزیٰ کو اہل عرب الٰہ (معبود) سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس ماحول میں ان کی قسم کھانا توحید کا انکار اور ان پر ایمان کی صریح علامت قرار پاتا ہے، کسی مسلمان سے شعوری طور پر اس کفر کا صدور ممکن ہی نہیں۔

البتہ، اگر کبھی بے خیالی میں یا غلطی سے ایسا کلمہ کسی مسلمان کی زبان سے نکل جائے تو اس موقع پر استغفار کرنے کا طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سکھایا کہ ایسا شخص فوراً 'لا الٰہ الا اللہ' کہے۔

۲۔ اسلام میں جوا کھیلنا ممنوع ہے، کیونکہ یہ مال حاصل کرنے کے باطل طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ قرآن مجید میں اسے 'رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ' (نجس، شیطانی کام) کہا گیا ہے۔ اس کی طرف دعوت دینا ایک نجس اور شیطانی کام کی طرف دعوت دینا ہے۔ چنانچہ جوا کی طرف بلانے والے کی غلطی سے توبہ کی شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز فرمائی کہ ایسا شخص کچھ نہ کچھ صدقہ کرے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ روایت بخاری، رقم ۵۷۵۶ ہے۔ بعض معمولی اختلافات کے ساتھ یہی مضمون یا اس کے کچھ حصے حسب ذیل (۱۵) مقامات پر نقل ہوئے ہیں:

بخاری، رقم ۴۵۷۹، ۵۹۴۲، ۶۲۷۴؛ مسلم، رقم ۱۶۴۷ (۲)؛ ابوداؤد، رقم ۳۲۴۷؛ ترمذی، رقم ۱۵۴۵؛ نسائی، رقم ۳۷۷۵؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۹۶؛ ابن خزیمہ، رقم ۴۵؛ احمد بن حنبل، رقم ۸۰۷۳؛ ابن حبان، رقم ۵۷۰۵؛ بیہقی، رقم ۶۶۶، ۶۶۷، ۱۹۶۱۸۔

۲۔ 'بِشَیْءٍ'، یہ الفاظ مسلم، رقم ۱۶۴۷ سے لیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۴۵۷۹ میں 'مَنْ حَلَفَ مِنْكُمْ' کے بجائے 'مَنْ حَلَفَ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۱۶۴۷ میں 'مَنْ حَلَفَ مِنْكُمْ' کے بجائے 'مَنْ حَلَفَ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰى' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۳۲۴۷ میں 'بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰى' کے بجائے 'وَاللَّاتِ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۷۷۵ میں 'بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰى' کے بجائے 'بِاللَّاتِ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۲۰۹۶ میں 'فِي حَلْفِهِ' کے بجائے 'يَمِيْنِهِ' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

معز امجد

میت کے ذمے روزوں کی قضا اور نذر کا معاملہ

روایت کا مضمون

ترمذی، رقم ۷۱۸ کے مطابق روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إذا کان علی المیت نذر صیام یصوم عنه وإذا کان علیه قضاء رمضان أطعم عنه.

''جب میت کے ذمے روزوں کی نذر ہو تو (میت کے ذمہ دار کو چاہیے کہ) وہ اس کی جانب سے روزے رکھے اور جب میت پر رمضان کے روزوں کی قضا ہو تو (اس کے ذمہ دار کو چاہیے کہ) وہ اس کی طرف سے (مسکینوں کو) کھانا کھلائے۔''

روایت پر تبصرہ

علامہ البانی نے اپنی کتاب ''ضعیف سنن الترمذی'' (رقم ۷۱۸) میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

نتیجۂ بحث

مذکورہ روایت کی سند پر البانی صاحب کے تبصرے کے پیش نظر احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس روایت کی نسبت کو درست نہ سمجھا جائے۔

محمد عمار خان ناصر

قصاص و دیت میں مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز

[یہ مصنف کی زیر طبع کتاب ''حدود و تعزیرات ـــــ چند اہم مباحث'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث کو بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔]

ـــــ ۵ ـــــ

قصاص کے قانون کے ضمن میں ایک اہم بحث یہ ہے کہ آیا کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کی صورت میں اس کے مسلمان قاتل سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟ مسلم اور غیر مسلم کی دیت میں فرق کا سوال بھی اسی بحث کا حصہ ہے۔ بیش تر فقہی مکاتب فکر غیر مسلم کی جان کو قانونی اعتبار سے مسلمان کی جان کے مساوی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ان کے نزدیک غیر مسلم کو قتل کرنے کی صورت میں مسلمان سے قصاص نہیں لیا جا سکتا اور غیر مسلموں کی دیت بھی مسلمانوں کی دیت کے نصف ہوگی، البتہ فقہاے احناف دونوں حوالوں سے مسلم اور معاہد غیر مسلم کے مابین کسی فرق اور امتیاز کے قائل نہیں۔

اصولی طور پر یہ سوال اس بحث کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ آیا شارع کی نظر میں تمام انسانی جانیں دنیوی حرمت کے لحاظ سے یکساں درجہ اور قیمت رکھتی ہیں یا عقیدہ و مذہب کا اختلاف اس معاملے میں تفاوت پیدا کرنے کا موجب بن سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ کفر فی نفسہ انسان کی جان کو محترم نہیں رہنے دیتا۔ چنانچہ ان کے نزدیک ہر وہ غیر مسلم جس تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو اور اس نے اس کے بعد بھی کفر پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا ہو، مباح الدم ہے، الّا یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے دی گئی کسی امان کے تحت اسے جان کا تحفظ حاصل ہو

جائے۔ البتہ ان کے مابین اس نکتے میں اختلاف ہے کہ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست کے ساتھ معاہدۂ ذمہ کی صورت میں جو امان دی جاتی ہے، آیا اس سے اباحت دم کا سبب بالکلیہ ختم ہو جاتا اور غیر مسلم کی جان قانونی احکام کے اعتبار سے مسلمان کے مساوی قرار پاتی ہے یا جان کو تحفظ حاصل ہو جانے کے باوجود قانونی دائرے میں اس کی جان کی قیمت مسلمانوں سے کم تر ہی تصور کی جائے گی؟ احناف پہلے نقطۂ نظر کے قائل ہیں، جبکہ جمہور فقہا کے نزدیک اہل ذمہ کو جان کا تحفظ حاصل ہونے کے بعد بھی اباحت دم کا شبہ باقی رہتا ہے جس کا اثر قصاص اور دیت کے احکام پر مرتب ہوگا۔

قرآن مجید کے نصوص سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانی جان کی دنیوی حرمت کے دائرے میں اصولی طور پر مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ چنانچہ 'مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًا بِغَیۡرِ نَفۡسٍ' اور 'لَا یَقۡتُلُوۡنَ النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ' اور ان کے ہم معنی نصوص میں قتل ناحق کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ نکتہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کسی بھی شخص کے قتل کیے جانے پر، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، قاتل کو سزا بھی ایک جیسی دی جائے اور سزا میں، چاہے وہ قصاص کی صورت میں ہو یا دیت کی شکل میں، مذہب کی بنیاد پر کوئی فرق نہ کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول متعدد روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر بنو کعب کے ایک فرد نے بنو بکر کے ایک مشرک کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے قبیلے کے لوگوں سے کہا کہ وہ چاہیں تو قاتل سے قصاص لے لیں اور چاہیں تو دیت لے لیں۔[1] آپ نے بنو خزاعہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

انکم معشر خزاعة قتلتم هذا الرجل من هذيل القتيل و انی عاقله فمن قتل له قتيل بعد اليوم فاهله بين خيرتين اما ان يقتلوا او ياخذوا العقل.
(ترمذی، رقم ۱۳۲۶)

''اے گروہ خزاعہ، تم نے ہذیل کے اس شخص کو قتل کیا ہے اور میں اس کی دیت ادا کر رہا ہوں، لیکن آج کے بعد اگر کسی شخص کو قتل کیا جائے گا تو اس کے اہل خانہ کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو قاتل سے قصاص لے لیں اور چاہیں تو دیت قبول کر لیں۔[2]''

---

[1] طبری، تہذیب الآثار، مسند ابن عباس، رقم ۴۲۔

[2] عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ جب بنو خزاعہ کی طرف سے بنو ہذیل کے مشرک کو قتل کرنے کا واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آیا تو آپ نے فرمایا کہ 'لو كنت قاتلا مومنًا بكافر لقتلته به' (طبرانی، المعجم الکبیر ۱۸/ ۱۱۰۔ مسند البزار، رقم ۳۵۹۴۔ سنن الدارقطنی ۳/ ۱۳۷) یعنی اگر میں کسی کافر کے قصاص میں کسی مومن کو قتل کرتا تو اس شخص کو قتل کر دیتا، تاہم یہ روایت متن میں مذکور ان مستند روایات کے منافی ہے جن کے مطابق آپ نے اس

ایک ضعیف روایت میں بیان ہوا ہے کہ جب ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر اس کے مسلمان قاتل کو قتل کرنے کا حکم دے دیا کہ 'انا احق من اوفی بذمتہ'[۳]، یعنی جس نے اپنا عہد پورا کیا ہو، اس کا بدلہ لینے کا سب سے زیادہ حق میں رکھتا ہوں۔

اسی طرح متعدد واقعات میں یہ نقل ہوا ہے کہ آپ نے غیر مسلم مقتولین کے لیے مسلمانوں کے برابر دیت ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ واقعات حسب ذیل ہیں:

عمرو بن امیہ الضمری نے واقعہ بئر معونہ کے شہدا کا بدلہ لینے کے لیے بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دیت ادا کی جو دو آزاد مسلمانوں کی دیت کے مساوی تھی[۴]۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے اپنے خطبے میں جاہلیت کے دور سے چلے آنے والے انتقامی سلسلوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا اور دیت کے حوالے سے یہ عمومی قانون بیان فرمایا کہ:

الا ان دیة الخطا شبه العمد ما كان بالسوط والعصا مائة من الابل منها اربعون فی بطونها اولادها.	''سنو، ایسے قتل خطا کی دیت جو عمد کے مشابہ ہو، یعنی جس میں چھڑی اور لاٹھی کے ذریعے سے کسی کو قتل کیا گیا ہو، سو اونٹ ہوگی اور ان میں چالیس ایسی اونٹنیاں ہونی چاہییں جن کے پیٹ میں بچہ ہو۔''
	(ابوداؤد، رقم ۳۹۴۱)

اس خطبے کے مخاطب قریش کے مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی دیت میں فرق کا کوئی ذکر نہیں فرمایا جو موقع کلام کے تناظر میں اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت ایسا کوئی فرق قائم کرنا نہیں چاہتی۔ چنانچہ فتح مکہ ہی کے موقع پر خراش بن امیہ خزاعی نے، جو مسلمان تھے، ایک مشرک کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر بنو خزاعہ نے اس کی دیت کے طور پر سو اونٹ ادا کیے[۵]۔

فتح مکہ ہی کے موقع پر خالد بن الولید نے بنو جذیمہ کے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کو بھیج کر ان سب کی دیت ادا کی۔ اس واقعے میں آپ نے سیدنا علی کو وافر مال دے

موقع پر بنو ہذیل کے مشرک مقتول کی نہ صرف پوری دیت دلوائی، بلکہ یہ اعلان بھی فرمایا کہ اب اگر کسی نے کسی کو قتل کیا تو مقتول کے اولیا کو قاتل سے قصاص لینے کا حق حاصل ہوگا۔

۳؎ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۶۹۵-۱۵۷۰۳۔

۴؎ ترمذی، رقم ۱۳۲۴۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۱۲۷، ۱۶۱۲۹۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۱۳۹/۴۔

۵؎ طبری، تہذیب الآثار، مسند ابن عباس، رقم ۴۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۹/۵۷۔ ابن حجر، الاصابہ ۵۰۶/۱۔

کر بھیجا جس سے بنو جذیمہ کے جانی اور مالی ہر طرح کے نقصان کی کھلے دل سے تلافی کی گئی، یہاں تک کہ جب تمام معاوضے ادا کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی تو سیدنا علی نے وہ بھی انھیں دے دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کی تحسین کی[6]۔ یہاں قرائن یہی بتاتے ہیں کہ مسلم اور غیر مسلم کی دیت کے فرق کا سوال اٹھائے بغیر اہل عرب کے عرف میں دیت کی جو مقدار رائج تھی، وہی ادا کی گئی تھی۔

ایک مقدمے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانۂ جاہلیت میں قتل ہونے والے ایک شخص کے قاتل کو، جو مسلمان تھا، حکم دیا کہ وہ مقتول کے بیٹے کو سو اونٹ ادا کرے[7]۔

ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذمی کے قتل پر مسلمان کی دیت کے برابر دیت ادا کی[8]۔ روایت کے ایک طریق میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ 'دیة الذمیدیة المسلم[9]'، یعنی ذمی کی دیت مسلمان کے مساوی ہے۔

اسامہ بن زید کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہد کی دیت مسلمان کے برابر، یعنی ایک ہزار دینار مقرر کی[10]۔

مذکورہ روایات میں سے بعض اگرچہ محدثین کے کڑے فنی معیار پر پورا نہیں اترتیں، تاہم ان کو بالکلیہ بے اصل بھی قرار نہیں دیا جا سکتا اور ان میں تاریخی یا فقہی استدلال کا ماخذ بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

کتب حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی بعض روایات میں قصاص اور دیت کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین فرق کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المؤمنون تکافؤ دماؤھم وھم ید علی　　　　''مسلمانوں کے خون آپس میں یکساں درجہ رکھتے

---

[6] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۵/۹۶۔

[7] بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۲۶۷۔ جصاص، احکام القرآن ۳/۲۰۵۔

[8] جصاص، احکام القرآن ۳/۲۱۳۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۱۳۰۔

[9] المعجم الاوسط، رقم ۷۹۱۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہد کی دیت کو مسلمان کی دیت کے نصف قرار دینا بھی نقل ہوا ہے، (المعجم الاوسط، رقم ۷۵۸۲) اس طرح ابن عمر کی یہ دونوں روایتیں باہم متعارض قرار پاتی ہیں۔

[10] ابن ابی عاصم، الدیات ۱/۴۷۔

من سواهم، يسعى بذمتهم ادناهم، لا يقتل مومن بكافر ولا ذو عهد في عهده. (نسائی، رقم ۴۶۵۴)

ہیں اور وہ دوسروں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ ان میں سے کم ترین آدمی بھی ان کی طرف سے کسی کو پناہ دینے کا اہل ہے۔ نہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلے میں قتل کیا جائے اور نہ ایسے غیر مسلم کو جس کا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ ہو۔‘‘

اس مفہوم کی روایات سیدہ عائشہ[11]، ابن عباس[12]، عبداللہ بن عمرو بن العاص[13]، عبداللہ بن عمر[14] اور معقل بن یسار[15] رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

عقل الكافر نصف عقل المومن. (نسائی، رقم ۴۷۲۵)

’’کافر کی دیت مسلمان کی دیت کے نصف ہے۔‘‘

جمہور فقہا نے ’لا يقتل مومن بكافر‘ کا مفہوم یہ مراد لیا ہے کہ کسی مسلمان کو غیر مسلم کے قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا، تاہم روایت کا موقع ومحل یہ مفہوم مراد لینے میں مانع ہے۔ روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فتح مکہ کے موقع پر اپنے خطبے میں ارشاد فرمائی تھی[16]۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ایک مشرک مقتول کے اولیا کو اس کے مسلمان قاتل سے قصاص یا دیت لینے کا اختیار دیا تھا، بلکہ یہ عمومی قانون بھی بیان فرمایا کہ آج کے بعد اگر کسی شخص کو قتل کیا جائے گا تو اس کے اہل خانہ کو حق ہوگا کہ وہ چاہیں تو قاتل سے قصاص لے لیں اور چاہیں تو دیت قبول کر لیں۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر مسلمان کو غیر مسلم کے قصاص میں قتل نہ کرنے کا قانون بیان کرنا ایک تناقض قرار پاتا ہے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جصاص نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ’لا يقتل مسلم بكافر‘ میں کافر سے مراد وہ کافر ہے جسے کسی مسلمان نے

---

[11] سنن الدار قطنی ۳/۱۳۱۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۴۷۵۷۔

[12] ابن ماجہ، رقم ۲۶۵۰۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۸۴۷۵۔

[13] ابوداؤد، رقم ۲۲۷۴۔ مسند احمد، رقم ۶۴۰۳۔

[14] صحیح ابن حبان، رقم ۵۹۹۶۔

[15] طبرانی، المعجم الکبیر ۲۰/۲۰۶۔

[16] مسند احمد، رقم ۶۴۰۵۔

زمانہ جاہلیت میں قتل کیا ہو[17]۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سرے سے مسلم اور غیر مسلم کے قصاص کے حوالے سے کوئی قانونی حکم بیان ہی نہیں فرما رہے۔ آپ دراصل فتح مکہ کے موقع پر مشرکین کے بڑی تعداد میں مسلمان ہو جانے کے تناظر میں لوگوں کو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ ان کے مابین اس سے پہلے قتل اور قصاص کے جو معاملات چلے آ رہے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد وہ کالعدم ہو چکے ہیں، اس لیے اگر کسی شخص نے حالت کفر میں کسی کو قتل کیا تھا تو اب اسلام قبول کرنے کے بعد اسے اس کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ بات 'الاسلام یجب ما کان قبلہ' (اسلام قبول کر لینا اس سے پہلے کے تمام گناہوں کا خاتمہ کر دیتا ہے) کے اصول کی وضاحت ہے اور آپ حالت کفر میں کیے گئے قتل کا بدلہ حالت اسلام میں لینے کی ممانعت بیان کر رہے ہیں، نہ کہ قصاص کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین عدم مساوات کا حکم۔ اس تناظر میں 'ولا ذو عہد فی عہدہ' کی تصریح سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان سے کسی ایسے قتل کا قصاص نہیں لیا جا سکتا جس کا ارتکاب اس نے حالت کفر میں کیا تھا، اسی طرح جن قبائل کے مسلمانوں کے ساتھ معاہدے ہیں، ان کے کسی فرد کو بھی زمانہ جاہلیت میں کیے جانے والے کسی قتل کی پاداش میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔

اس رائے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے مختلف مسلمان گروہوں کے مابین جو معاہدہ کرایا تھا، اس میں بھی یہ بات شامل تھی کہ 'لا یقتل مومن مومنًا فی کافر[18]'، یعنی یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں قصاص سے متعلق کوئی قانونی حکم بیان نہیں کیا جا رہا، بلکہ ایسا نہ کرنے کا عہد لیا جا رہا ہے اور مدینہ کے قبائل کے مابین زمانۂ جاہلیت سے چلے آنے والے انتقامی سلسلوں کے تناظر میں یہ بات پوری طرح قابل فہم اور برمحل دکھائی دیتی ہے۔

مزید براں اس مشہور و معروف خطبے میں بیان کی جانے والی ہدایت کی نوعیت اگر کسی قانونی حکم کی ہوتی تو فقہائے صحابہ یقیناً اس سے واقف ہوتے، لیکن روایات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ سیدنا عمر کے فیصلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص کے معاملے میں ان کا اصل رجحان مسلم اور غیر مسلم کے مابین مساوات ہی کو ملحوظ رکھنے کا تھا، تاہم دیگر صحابہ کے توجہ دلانے پر انھوں نے ایک دوسرے پہلو سے دونوں میں فرق کرنے کو درست تسلیم کر لیا۔ چنانچہ ایک مقدمے میں انھوں نے ایک غیر مسلم کو قتل کرنے والے مسلمان کو قصاص میں قتل کرنا چاہا تو ابو عبیدہ بن الجراح رضی

---

[17] احکام القرآن ۱/۱۷۶۔

[18] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۳/۳۳۔

اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ بتایئے، اگر اس شخص نے اپنے کسی غلام کو قتل کیا ہوتا تو کیا آپ قصاص میں اسے قتل کرتے؟ اس پر سیدنا عمر خاموش ہو گئے اور قاتل پر آدھی کے بجائے پوری دیت لازم کر دی۔[19] یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ سیدنا عمر اور حضرت ابوعبیدہ جیسے اکابر مہاجرین، جو فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، آپ کے خطبے سے غیر حاضر رہے ہوں گے یا اس کی اطلاع ان تک نہیں پہنچی ہوگی۔ اس تناظر میں سیدنا عمر کا ایک مسلمان سے غیر مسلم کا قصاص لینے کا حکم دینا اور حضرت ابوعبیدہ کا اس کے معارضے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حوالہ دینے کے بجائے ایک قیاسی استدلال پیش کرنا بے حد نا قابل فہم ہے۔

حیرہ میں اس طرح کا واقعہ پیش آیا تو سیدنا عمر نے خط لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثا کے سپرد کر دیا جائے تا کہ وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں اور چاہیں تو معاف کر دیں۔ پھر بعد میں انھوں نے دوبارہ لکھا کہ اگر قاتل کو قتل نہ کیا گیا ہو تو اسے قتل نہ کرو، لیکن اسے قتل کیا جا چکا تھا۔ بعض مقدمات میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر قاتل نے اشتعال میں آ کر اتفاقیہ قتل کا ارتکاب کیا ہے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے، لیکن اگر وہ پہلے بھی قتل کے مقدمات میں ملوث اور عادی مجرم ہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔[20]

امام مالک کی روایت کے مطابق سیدنا عمر نے اپنے ایک سالار کو لکھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ لشکر کے کچھ لوگ دشمن سپاہیوں کو امان دے کر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرتے ہیں اور پھر انھیں قتل کر دیتے ہیں۔ بخدا، اگر مجھے کسی کے بارے میں بھی یہ پتا چلا کہ اس نے ایسا کیا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔[21]

سیدنا عثمان سے منقول فتووں میں باہم تعارض دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف ان کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ اگر مسلمان کسی یہودی یا نصرانی کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو بھی اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا،[22] جبکہ دوسری طرف شام کے ایک ذمی کے قتل کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے مسلمان قاتل کو قتل کرنے کا حکم دے دیا، لیکن پھر سیدنا زبیر اور دیگر صحابہ کے منع کرنے پر انھوں نے مقتول کے ورثا کو ایک ہزار دینار بطور دیت دلوائے۔[23]

سیدنا علی سے بھی، جو مذکورہ ارشاد نبوی کے راوی ہیں، متعارض آرا نقل ہوئی ہیں۔ ایک طرف ان کا یہ قول نقل

---

۱۹ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۷۰۵۔

۲۰ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۷۰۷۔

۲۱ الشافعی، الام ۷/۲۴۱۔

۲۲ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۷۵۔

۲۳ الشیبانی، الحجۃ علیٰ اہل المدینہ ۴/۳۵۷۔

ہوا ہے کہ سنت یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے[24]، جبکہ دوسری طرف ان سے غیر مسلم کا قصاص لینے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ذمی کے قتل کے مقدمے میں مسلمان قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا تو مقتول کے بھائی نے حاضر ہو کر ان سے کہا کہ میں نے اس کو معاف کر دیا ہے۔ امیر المومنین نے کہا کہ شاید ان لوگوں نے تمھیں ڈرایا دھمکایا ہے؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ قاتل کو قتل کر دینے سے میرا بھائی واپس نہیں آ جائے گا، جبکہ ان لوگوں نے مجھے دیت دینے کی پیش کش کی ہے جس پر میں راضی ہوں۔ سیدنا علی نے فرمایا: اچھا پھر تم جانو۔ اس موقع پر انھوں نے فرمایا کہ 'من كانت له ذمتنا فدمه كدمنا و ديته كديتنا'[25]۔ یعنی جس شخص کو ہمارا ذمہ حاصل ہو، اس کا خون بھی ہمارے خون کی طرح ہے اور اس کی دیت بھی ہماری دیت کے برابر ہے۔ ایک دوسری روایت میں ان کا قول یہ نقل ہوا ہے کہ مسلمان اگر کسی یہودی یا نصرانی کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا[26]۔

عبد اللہ بن مسعود سے بھی بعض مقدمات میں مسلمان سے غیر مسلم کا قصاص لینا منقول ہے[27]۔

دیت کے معاملے میں بھی صحابہ اور تابعین کی آرا اور فتاویٰ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم کی دیت کی مقدار کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ کوئی سنت یا آپ کا کوئی ارشاد ان کے پیش نظر نہیں ہے اور وہ قیاس و اجتہاد سے کام لیتے ہوئے رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا عمر سے بعض روایات میں اہل کتاب کی پوری دیت اور بعض میں چار ہزار درہم دلوانے کا ذکر ملتا ہے[28]۔ ابو موسیٰ اشعری نے خط لکھ کر ان سے دریافت کیا کہ مسلمان اگر مجوسی کو قتل کر دے تو کیا کیا جائے؟ سیدنا عمر نے جواب میں لکھا کہ مجوسیوں کی حیثیت غلاموں کی سی ہے، اس لیے تمھارے ہاں جو قیمت ایک غلام کی ہے، وہی دیت کے طور پر ادا کی جائے۔ ابو موسیٰ نے انھیں لکھا کہ غلام کی قیمت آٹھ سو درہم ہے تو سیدنا عمر نے مجوسی کی دیت یہی مقرر کر دی[29]۔ صحابہ اور تابعین کے بیش تر آثار میں

---

[24] سنن الدار قطنی ۳/ ۱۳۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۷۷۔

[25] بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۷۱۲۔

[26] مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۶۱۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۴۹۴۔

[27] مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۶۰-۲۷۴۷۷۔ ابن ابی عاصم، الدیات ۱/ ۷۰۔

[28] ابو یوسف، کتاب الآثار، رقم ۹۷۲۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۵۴۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۵۷۰۵۔

[29] مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۴۸۴۔

مجوسی کی دیت کی مقدار آٹھ سو درہم ہی بیان ہوئی ہے، تاہم ابن مسعود مجوسی کے لیے پوری دیت کے قائل تھے اور سیدنا علی سے بھی ایک روایت میں یہی بات نقل ہوئی ہے۔[30]

سیدنا عثمان سے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم دلوانا منقول ہے، لیکن خود ان سے اور ان کے علاوہ سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، اور سیدنا علی سے یہ رائے بھی منقول ہے کہ معاہد غیر مسلم کی دیت مسلمان کے مساوی ہے۔[31]

متعدد تابعین کے ہاں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ادوار میں غیر مسلموں کی دیت پوری ہی ادا کی جاتی تھی۔ چنانچہ ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ یہودی، نصرانی اور مجوسی کی دیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر سیدنا عثمان کے عہد تک مسلمان کے برابر ہی ادا کی جاتی تھی، لیکن امیر معاویہ نے نصف دیت مقتول کے ورثا کو ادا کرنے، جبکہ باقی نصف بیت المال میں جمع کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا۔[32] اسی طرح یعقوب بن عتبہ، صالح اور اسماعیل بن محمد بیان کرتے ہیں کہ معاہد غیر مسلموں کی دیت مسلمانوں کے برابر ادا کیے جانے کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔[33] سلیمان بن یسار بیان کرتے ہیں کہ پہلے دور میں مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم دی جاتی تھی، جبکہ یہودی اور نصرانی مقتول کی دیت اسی مقدار کے مطابق ادا کی جاتی تھی جو مسلمانوں کے مابین رائج تھی۔[34]

یقیناً ان آثار سے اس بات کی نفی لازم نہیں آتی کہ اس سے مختلف مقداریں ادا کرنے کا طریقہ بھی موجود رہا ہو، لیکن پوری دیت ادا کرنے کا طریقہ ان سے، بہر حال ثابت ہوتا ہے۔

صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ میں پائے جانے والے مذکورہ اختلاف اور تنوع کے تناظر میں یہ قرار دینا مشکل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص اور دیت کے معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کے مابین امتیاز کو ایک 'سنت' کی حیثیت سے جاری کیا ہوگا یا قانونی طور پر اس کی پابندی لازم قرار دی ہوگی۔ چنانچہ فقہاے احناف نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی زیر بحث روایت کو دیگر دلائل کے منافی ہونے کی بنیاد پر ثابت تسلیم نہیں کیا۔[35] جصاص نے اس روایت کے

---

[30] مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۴۹۴، ۱۸۴۹۷۔

[31] ابو یوسف، کتاب الآثار، رقم ۹۷۲۔ الشیبانی، الحجۃ علیٰ اہل المدینہ ۴/ ۳۵۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۴۴ - ۲۷۴۵۶۔ طبرانی، المعجم الکبیر، رقم ۹۷۳۹۔

[32] مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۴۹۱۔

[33] مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۴۹۸۔

[34] مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۷۴۵۷۔

بارے میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر آپ نے یہ بات فتح مکہ کے موقع پر اپنے خطبے میں ارشاد فرمائی ہوتی تو اکابر صحابہ اور تابعین کو پوری طرح اس سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ امام شافعی نے بھی اس ارشاد کو عمرو بن شعیب سے منقول ہونے کی بنا پر قبول نہیں کیا اور اس کے بجائے یہودی اور نصرانی کی دیت کے ایک تہائی ہونے کے حق میں سیدنا عمر اور سیدنا عثمان کے آثار کا حوالہ دیا ہے۔[۳۶]

روایت کی صحت کو ثابت ماننے کی صورت میں یہ امکان قابل غور ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی طور پر غیر مسلموں کی دیت مسلمانوں کے نصف مقرر کرنے کے بجائے کسی مخصوص مقدمے میں بعض اضافی وجوہ سے اس کا فیصلہ فرمایا ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ جب ایک سریے میں صحابہ نے کچھ لوگوں کو اسلام قبول کرنے کے باوجود قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولوں کے لیے نصف دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔[۳۷] اصولی طور پر ان مقتولوں کی پوری دیت ادا کی جانی چاہیے تھی، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص صورت حال کے تناظر میں قاتلین کو آدھی دیت معاف کر دی۔ جن مقدمات میں آپ نے غیر مسلم مقتولوں کے لیے آدھی دیت کا فیصلہ فرمایا، اگر وہ بھی اسی نوعیت کے تھے تو ظاہر ہے کہ اسے عمومی اصول کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

امام شافعی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول روایات کے علاوہ مسلم اور غیر مسلم کے مابین امتیاز کی ایک اصولی اساس بھی بیان کی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۲۸ میں اہل ذمہ پر 'جزیہ' عائد کرنے کا حکم دیا ہے جو ان کی محکومانہ حیثیت کی ایک علامت ہے اور اس کی رو سے وہ قانونی و معاشرتی امور میں مسلمانوں کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔[۳۸] ابن حزم نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین قانونی و معاشرتی امتیاز کے بعض دیگر مظاہر، مثلاً انھیں سلام کرنے میں پہل سے گریز کرنے اور راستے میں انھیں تنگ جگہ پر چلنے پر مجبور کرنے،[۳۹] ان کی گردنوں پر علامتی مہر لگانے،[۴۰] مسلمانوں کے ساتھ مشابہت سے بچنے کے لیے مخصوص لباس اور سواریوں کو ان کے

۳۵۔ جصاص، احکام القرآن ۳/ ۲۱۴۔ سرخسی، المبسوط ۲۶/ ۵۸۔

۳۶۔ الشافعی، الام ۴/ ۲۸۹، ۶/ ۱۰۵، ۷/ ۳۲۴۔

۳۷۔ ترمذی، رقم ۱۵۳۰۔

۳۸۔ الشافعی، الام ۷/ ۳۲۱۔

۳۹۔ مسلم، رقم ۴۰۳۰۔

۴۰۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۸۴۹۸۔

لیے ممنوع قرار دینے[41] اور مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی گواہی قبول نہ کرنے وغیرہ کو بھی مذکورہ اصول ہی کے فروع قرار دیا ہے[42]۔

ہمارے نزدیک اس استدلال میں وزن پایا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاملے کے ایک اور پہلو کو ملحوظ رکھنا بھی بے حد اہم ہے۔ کلاسیکی فقہا اہل ذمہ کے حقوق و اختیارات سے متعلق بعض جزوی اختلافات سے قطع نظر، اصولی طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی ریاست کے تعلق کی آئیڈیل صورت عقد ذمہ ہی ہے جس میں ان پر جزیہ کی ادائیگی اور دیگر شرائط کی پابندی لازم ہو اور وہ کفر و اسلام کے اعتقادی تناظر میں اہل اسلام کے محکوم اور ان کے مقابلے میں ذلیل اور پست ہو کر رہیں۔ فقہا کے نزدیک یہ اصول تمام غیر مسلموں پر لاگو ہوتا ہے، خواہ وہ جنگ کے نتیجے میں مفتوح ہوئے ہوں یا صلح کے کسی معاہدے کے تحت مسلمانوں کے زیر نگیں آئے ہوں یا دار الحرب کی شہریت سے دست بردار ہو کر دار الاسلام میں قیام پذیر ہونا چاہتے ہوں، تاہم معاصر فقہی زاویۂ نگاہ میں اس موقف سے اتفاق کو ضروری نہیں سمجھا گیا اور یہ نقطۂ نظر عام ہے کہ جدید اسلامی ریاستوں میں غیر مسلموں کی حیثیت 'اہل ذمہ' کی نہیں ہے۔ چنانچہ ان پر جزیہ عائد کرنے یا روایتی فقہی ذخیرے میں اہل ذمہ کے لیے مقرر کردہ امتیازی پابندیوں اور علامات کو نافذ کرنے پر اصرار نہیں کیا جا سکتا[43]۔

یہ زاویۂ نگاہ قابل لحاظ فکری بنیادیں رکھتا ہے، لیکن اس کو اختیار کرنے والے اہل فکر کی تحریریں اس معاملے میں بالعموم واضح نہیں کہ ان کے نزدیک روایتی فقہی تصور سے اختلاف کی اصل بنیاد کیا ہے۔ آیا وہ اسے اصولی طور پر غلط اور بے بنیاد سمجھتے ہیں یا محض معاصر بین الاقوامی سیاسی و قانونی ڈھانچے میں اسے ناقابل عمل پاتے ہوئے متبادل راستہ تجویز کر رہے ہیں؟ ایک نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ عقیدہ و مذہب کی بنیاد پر اسلامی ریاست کے باشندوں کے مدنی حقوق میں امتیاز کا رویہ مخصوص تاریخی اسباب کا نتیجہ تھا اور سیدنا عمر نے اس وقت کی معاصر اقوام میں محکوم و مفتوح قوموں کے لیے رائج قانونی نظام ہی کو اہل ذمہ پر نافذ کر دیا تھا[44]، تاہم یہ بات درست دکھائی نہیں دیتی، کیونکہ 'اہل ذمہ' اور ان

---

[41] بیہقی، رقم ۱۸۴۹۸۔

[42] ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۴۸۹۔

[43] ابو الاعلیٰ مودودی، رسائل و مسائل ۴/۲۴۶۔ امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست ۲۲۱ - ۲۲۷۔ نجات اللہ صدیقی، اسلام، معاشیات اور ادب ۴۱۹۔ سید حامد عبد الرحمٰن الکاف، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، دسمبر ۲۰۰۲، ۶۵ - ۶۶۔ یوسف القرضاوی، فقہ الزکوٰۃ، مترجم: ساجد الرحمٰن صدیقی ۱/۱۳۶ - ۱۳۸۔

کی مخصوص محکومانہ حیثیت کے فقہی تصور کی اساسات قرآن وسنت کے نصوص میں پائی جاتی ہیں اور اگر جدید معاشرے میں اس کا تسلسل ضروری نہیں تو بھی شرعی و عقلی طور پر اس تصور کی توجیہ تاریخی نہیں، بلکہ مذہبی بنیادوں پر کی جانی چاہیے۔

اس ضمن میں جناب جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر قابل غور ہے۔ ان کی راے میں سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۲۸ میں اہل کتاب کو محکوم بنا کر ان پر جزیہ عائد کرنے کا حکم، جو اہل ذمہ سے متعلق روایتی فقہی تصور کی اصل بنیاد ہے، شریعت کا کوئی ابدی قانون نہیں، بلکہ اس کا تعلق رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص سنت سے ہے۔ اس کی تفصیل وہ اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی رو سے منصب رسالت پر فائز کوئی ہستی جب کسی قوم میں مبعوث کر دی جاتی ہے تو اس فیصلے کے ساتھ کی جاتی ہے کہ رسول اور اس کے پیروکار اپنے مخالفوں پر، بہر حال غالب آ کر رہیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیرۂ عرب میں مبعوث کیا گیا تو اس سنت الٰہی کے مطابق یہ دوٹوک اعلان کر دیا گیا کہ آپ پر ایمان نہ لانے والوں کے لیے مغلوبیت اور محکومیت مقدر ہو چکی ہے۔ اس وعدے کا عملی ظہور جزیرۂ عرب کی حد تک تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہو گیا اور غلبۂ دین کی جدوجہد کے آخری مرحلے میں دین حق کے غلبہ کی دو صورتیں واضح طور پر متعین کر دی گئیں۔ مشرکین کے لیے تو لازم کیا گیا کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں، ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا، جبکہ اہل کتاب سے کہا گیا کہ وہ جزیہ دے کر مسلمانوں کی محکومی اور زیردستی قبول کر لیں۔ آپ کے بعد جزیرۂ عرب سے باہر روم، فارس اور مصر کی سلطنتوں تک اس غلبے کی توسیع کی ذمہ داری صحابۂ کرام پر عائد کی گئی جنھیں اس مقصد کے لیے 'شہادت علی الناس' کے منصب پر فائز کیا گیا تھا۔

غامدی صاحب کے نزدیک قانون رسالت کے تحت رسول اور اس کے پیروکاروں کا یہ غلبہ پوری دنیا کی قوموں پر نہیں، بلکہ ان مخاطبین پر ہوتا ہے جن پر اتمام حجت کیا جا چکا ہو۔ ان اقوام پر مذکورہ سنت الٰہی کا نفاذ چونکہ خدا کے براہ راست اذن کے تحت کیا جاتا ہے اور اس میں انسانوں حتیٰ کہ پیغمبروں کے اجتہادی فیصلے کا بھی کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لیے اسلامی تاریخ کے صدر اول میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں نے جو جہاد کیا، وہ غلبۂ دین کے اسی وعدے کی تکمیل کے لیے اور انھی اقوام تک محدود تھا جن کے خلاف اقدام کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی اور جن کی تعیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر، کر دی تھی۔ جزیرۂ عرب اور روم و

۴۴؎ سید سلیمان ندوی، ''کیا اسلام میں تجدید کی ضرورت ہے؟''، مشمولہ اسلامی تہذیب وثقافت ۱/ ۱۰۴، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

فارس کی سلطنتوں پر دین حق کا غلبہ قائم ہو جانے اور ان علاقوں کے غیر مسلم باشندوں کے محکوم بنا لیے جانے کا یہ عمل تاریخ میں مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے تکوینی طور پر اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ابدی اور آفاقی حکم نہیں تھا اور نہ اس کا ہدف پوری دنیا کے کفار کو مسلمانوں کا محکوم بنانا تھا، اس لیے اس کے بعد قیامت تک کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی بنیاد عمومی انسانی اخلاقیات ہی پر رکھی جائے گی۔[45]

اگر غیر مسلموں کو محکوم بنا کر ان پر جزیہ عائد کرنے کو شریعت کے عمومی قانون کے بجائے قانون رسالت پر مبنی قرار دینے کا مذکورہ نقطۂ نظر درست ہے تو اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ جو غیر مسلم قانون رسالت کے تحت 'جزیہ' عائد کرنے کے مذکورہ حکم کے دائرۂ اطلاق سے باہر ہیں، وہ اپنے انسانی اور قانونی حقوق کے لحاظ سے مسلمانوں کے مساوی تصور کیے جائیں گے اور شافعی فقہا کے ایک گروہ نے کم از کم اصولی طور پر اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ جن کفار تک اسلام کی باقاعدہ دعوت نہ پہنچی ہو، ان کی جانیں محفوظ ہیں اور اگر مسلمان انھیں قتل کر دیں تو ان کی دیت ادا کی جائے گی اور اس کی مقدار مسلمانوں کی دیت کے مساوی ہوگی۔ ماوردی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسانوں کی جان اصل میں محفوظ اور محترم ہے، جبکہ مباح الدم انھی کفار کو قرار دیا جا سکتا ہے جن کی طرف سے اسلام کے خلاف معاندت کا رویہ ظاہر ہو جائے۔[46]

فقہا بالعموم کسی غیر مسلم تک اسلام کی دعوت پہنچ جانے اور اس کے اسلام قبول نہ کرنے کو ہی اسلام کے خلاف محاربہ اور عناد کے ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ یہ بات کلاسیکی فقہی دور میں اپنا ایک محل رکھتی تھی، تاہم ''ارتداد کی سزا'' کے زیر عنوان ہم واضح کریں گے کہ اتمام حجت کے تحقق میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور زمان و مکان کا تغیر بھی اتمام حجت کی کیفیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے اگر دور جدید کے اہل علم اتمام حجت پر مبنی قوانین و احکام کے نفاذ کو معاصر تناظر میں غیر موزوں محسوس کرتے ہیں تو یہ زاویۂ نگاہ بے بنیاد نہیں، بلکہ فقہی و شرعی اصولوں کے مطابق اور ہر لحاظ سے توجہ کا مستحق ہے۔

---

[45] جاوید احمد غامدی، قانون جہاد ۳۲-۳۸۔

[46] الحاوی الکبیر ۱۲/۳۱۳۔

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

——۱۴——

سیرت وعہد

امام المجتہدین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی نظری (hypothetical) اجتہاد نہ کیا۔ ایک روز عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ نماز کے لیے کم از کم کتنے کپڑوں کی ضرورت ہے؟ ایک یا دو؟ عمر منبر پر چڑھے اور سخت تنبیہ کی، آج کے بعد اگر میں نے کسی کو اس طرح کا جدل کرتے سنا تو اسے خوب پیٹوں گا۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے، آپس میں اختلاف نہ کرو! کیونکہ تمھارا اختلاف بعد کی نسلوں میں بڑھ چڑھ کر سامنے آئے گا۔ ابتداے اسلام ہی سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرضی سوالات کرنے والوں کو لعنت ملامت کرتے تھے۔ خود کوئی راے بنانے سے پہلے وہ اجل صحابہ سے مشورہ کرتے حتیٰ کہ غبار چھٹ جاتا اور بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فتاویٰ مشرق و مغرب ہر سو مانے جاتے ہیں۔ ابن مسعود کا ارشاد ہے، عمر جس راہ سے گزر جاتے، ہم اسے سہل اور ہموار پاتے۔

انھوں نے اپنے فیصلوں میں اضطرار (مجبوری و ناچاری) کا اصول بھی مدنظر رکھا۔ ایک عورت زنا کے جرم میں ان کے پاس لائی گئی۔ وہ پیاس سے تڑپتی ہوئی ایک چرواہے کے پاس سے گزری اور اس سے پانی مانگا۔ چرواہے

نے اس شرط پر پانی پلایا کہ وہ اپنا آپ اس کے حوالے کر دے۔عمر نے حد نافذ کرنے سے پہلے صحابہ سے مشورہ کیا۔حضرت علی نے رائے دی،اسے مجبور کر دیا گیا تھا اس لیے اسے حکم قرآنی 'فمن اضطرّ غیر باغٍ و لا عادٍ فلا اثم علیہ انّ اللّٰہ غفور رحیم 'اور جو ناچار ہوا،اس حال میں کہ نافرمانی نہیں کی اور حد سے باہر نہ نکلا،اس پر کوئی گناہ نہیں۔اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے(بقرہ:۱۷۳) کی روشنی میں چھوڑ دیا جائے۔حاطب بن ابوبلتعہ کے غلاموں نے بنومزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چوری کر لیا۔وہ عمر کے پاس لائے گئے تو انھوں نے چوری کا اقرار کر لیا۔عمر نے کہا، مجھے معلوم ہے حاطب اپنے غلاموں سے خوب کام لیتا ہے اور انھیں بھوکا پیاسا رکھتا ہے۔پھر مزنی سے دریافت کیا،تمھاری اونٹنی کی کیا قیمت ہوگی؟اس نے کہا،۴۰۰ درہم۔انھوں نے حاطب کے بیٹے عبدالرحمان سے کہا،اسے ۸۰۰ درہم دے دو اور حد نافذ نہ کی۔اضطرار کا تعین کرنے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔عین ممکن ہے، منصف جسے اضطرار سمجھ رہا ہے،اضطرار ہی نہ ہو۔عام طور پر عورت کو ڈرا دھمکا کر ہی زنا پر راضی کیا جاتا ہے،اس لیے یہ طے کر لینا کہ کس طرح کی تخویف اضطرار ہے،لازمی امر ہے۔

خلیفۂ ثانی فیصلہ کرتے وقت مدعی اور مدعا علیہ سے ایک جیسا سلوک کرتے۔ایک یہودی نے حضرت علی کے خلاف دعویٰ کیا تو انھوں نے ان دونوں کو برابر بٹھا دیا۔فیصلے کے بعد علی سے پوچھا،آپ کو برا تو نہیں لگا؟انھوں نے کہا،ہرگز نہیں۔البتہ آپ نے مجھے میری کنیت 'ابوالحسن' سے پکارا تو مجھے اندیشہ ہوا،کہیں جادۂ انصاف سے ہٹ نہ جائیں کیونکہ کنیت سے پکارنا تعظیم والتفات کی نشانی ہے۔

حضرت عمر کی فقاہت کا بڑا ثبوت ان مسائل میں ان کا اجتہاد ہے جہاں کتاب اللہ کی نص صریح موجود نہ تھی۔ ایک قضیے میں ترکے کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ ماں جایے بھائی کو حصہ مل گیا جب کہ سگے بھائی کے لیے مال ہی نہ بچا۔ بات عمر تک پہنچی تو انھوں نے کہا،یہ انصاف کے منافی ہے اور سگے بھائی کو حصہ دلایا۔عہد فاروقی میں طاعون کی وبا پھیلی تو بے شمار مسلمانوں کی جانیں چلی گئیں۔تب میراث کے مسائل پیدا ہوئے،ان میں سے کچھ بے حد پیچیدہ تھے۔ عمر خود شام پہنچے،انھیں یہ قضایا نپٹانے میں کئی ہفتے لگ گئے تاہم تمام فریق ان کے منصفانہ فیصلوں سے مطمئن تھے۔

شام و عراق سے جو غنیمتیں حاصل ہوتی رہیں،ان کا خمس (۱/۵) امیر المومنین کو بھیجا جاتا جب کہ ۴/۵ حصے فاتح فوجیوں میں بانٹ دیے جاتے۔۱۸ لاکھ کلومیٹر (ساڑھے تین کروڑ جریب) پر مشتمل عراق کا سرسبز میدانی علاقہ (جسے سواد عراق کہا جاتا ہے) مسلمانوں کے قبضے میں آیا تو اسے بھی اسی طرح تقسیم کرنے کی تجویز آئی۔عمر رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی۔ان کا کہنا تھا،اگر یہ زمین فاتحین میں بانٹ دی گئی تو مسلمانوں کی اگلی نسلوں کے لیے کیا بچے گا؟

حضرت عبدالرحمان بن عوف نے کہا، اراضی بھی مال فے ہے اور اس پر غانمین کا حق ہے۔ جہاد میں حصہ لینے والے فوجی بھی سمجھتے تھے، عمران کا حق مار رہے ہیں۔ وہ تب بھی اپنی بات پر مصر رہے تو مشاورت کا فیصلہ ہوا۔ عبدالرحمابن عوف کی راے بیان ہو چکی، عثمان، طلحہ اور علی رضی اللہ عنہم نے عمر کی راے کو ترجیح دی۔ اوس کے پانچ اور خزرج کے پانچ اہل راے سے مشورہ کیا گیا۔ حضرت عمر سمجھتے تھے، اراضی تقسیم کرنے سے بہت سے لوگ اس سے محروم ہو جائیں گے، حکومت کی ضرورتیں بقیہ ۱/۵ علاقے سے پوری نہ ہو سکیں گی، باشندگان کے چلے جانے اور فوج کے منتشر ہو جانے کی وجہ سے اسلامی مملکت کی سرحدات کی حفاظت دشوار ہو جائے گی اور زمین کے قابضین کو دوسری جگہ کھپانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے اس زمین پر خراج لگانے کی تجویز پیش کی۔ ان کی راے قرآن وسنت کی کسی صریح نص پر مبنی نہ تھی، اس کی بجائے مسلمانوں کی منفعت عامہ ان کے پیش نظر تھی۔ مجلس شوریٰ کی اکثریت نے عمر کے حق میں فیصلہ دے دیا تو عثمان بن حُنیف انصاری کو سواد عراق کا والی مقرر کیا گیا۔ ان کے حسن انتظام سے محض کوفہ کا سالانہ خراج ۱۰ کروڑ درہم سے زیادہ وصول ہوا۔ شام کی فتح کے موقع پر بھی یہی سوال اٹھا، تب زبیر بن عوام اور بلال بن رباح نے مفتوحہ اراضی تقسیم کرنے پر زور دیا۔ سیدنا عمر نے اسی استدلال کی بنا پر اسے قابضین کے ہاتھ رہنے دیا۔ بے آباد زمین اسلامی حکومت کی ملکیت ٹھہری۔

عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات میں دانش اور پختگی ہونے کے ساتھ غریب رعایا سے ملاطفت جھلکتی تھی۔ وہ اہل ایمان کی نفسانی کم زوریاں دور کر کے ان کے اندرونی خیر کی نشوونما کرنا چاہتے تھے۔ ایک رات وہ مدینہ کی گشت پر تھے کہ کسی عورت کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا۔

الا سبیل الی خمر فاشربھا

ام ھل سبیل الی نصر بن حجاج

(کوئی طریقہ ہے کہ شراب مل جائے اور میں پی لوں؟ یا نصر بن حجاج کو پانے کی کوئی راہ بھی ہے؟)

صبح ہوئی تو عمر نے نصر کا پتا چلا کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ خوب صورت بالوں والا ایک خوب رو نوجوان تھا۔ انھوں نے اس کے بال کٹوا دیے، اس کا چہرہ نمایاں ہوا تو وہ اور خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ اسے عمامہ باندھا گیا تو اس کا حسن مزید نکھر گیا۔ عمر نے کہا، اب یہ ہمارے ساتھ نہیں رہے گا۔ اس کی ضروریات کا حساب لگا کر اسے کچھ رقم فراہم کی اور بصرہ رخصت کر دیا۔ کیا خوب صورت ہونا اس کا جرم تھا کہ اسے جلا وطن کر دیا جاتا؟ لیکن عمر مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کے ساتھ ان کے مربی بھی تھے۔ مدینہ کی عورتوں کو فتنے سے بچانے کے لیے انھوں نے یہ قدم

اٹھایا۔کسی اور شب کا ذکر ہے،انھوں نے کچھ خواتین کو باتیں کرتے سنا۔ایک نے پوچھا،مدینہ میں سب سے زیادہ خوب صورت کون ہے؟ دوسری نے جواب دیا،ابوذئب۔عمر نے اس کی بھی طلبی کر لی،وہ واقعی خوب صورت تھا۔عمر نے کہا،اللہ کی قسم!تم سچ مچ ذئب (عورتوں کا شکار کرنے والا بھیڑیا) ہو۔بات ابوذئب کی سمجھ میں آ گئی۔اس نے خود ہی کہا،مجھے بھی بصرہ بھیج دیا جائے۔

ایک رات ایک عورت اپنی بیٹی کو دودھ میں پانی ملانے کو کہہ رہی تھی۔بیٹی نے کہا،اماں!عمر نے اس سے منع کیا ہے۔ماں نے کہا،اس ظلمت شب میں عمر کہاں سے آئیں گے؟ بیٹی نے کہا،اللہ تو دیکھ رہا ہے۔صبح سویرے عمر نے اپنے بیٹوں کو بلا کر کہا،تم میں سے کوئی اس لڑکی سے نکاح کر سکتا ہے؟ عاصم مان گئے،اسی سنجوگ سے ام عاصم پیدا ہوئیں جو پانچویں خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز کی ماں ہوئیں۔طلحہ بن عبیداللہ نے عمر کو رات کے وقت ایک گھر میں جاتے دیکھا۔وہ کھوج لگانے کے لیے اندر گئے تو ایک معذور بڑھیا پائی۔اس نے بتایا،یہ شخص میری ضرورتیں پوری کرنے آتا ہے۔طلحہ خود سے یوں ہم کلام ہوئے،تیرا ناس ہو!تو عمر کی لغزشیں ڈھونڈ رہا ہے۔

عمر کا دروازہ تھا نہ دربان۔نماز کے بعد کچھ دیر کے لیے مسجد میں بیٹھ جاتے تاکہ کوئی ضرورت مند ان سے مل سکے۔ایک دوپہر کو نیند محسوس ہوئی تو درخت کے نیچے لیٹ کر سو گئے۔اتفاق سے قیصر روم کا سفیر آیا،انھیں دارالامارہ میں نہ پایا تو پوچھتا پچھتا وہاں پہنچ گیا۔انھیں کسی محافظ کے بغیر یوں تنہا سوئے ہوئے دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا،میرا آقا ظلم کرتا ہے،اس لیے پہرے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔آپ عدل وانصاف کرتے ہیں،اس لیے چین کی نیند سو رہے ہیں۔سفر میں عمر رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی خیمہ نصب نہ کیا جاتا،کسی درخت پر چادر ڈال کر سایہ کر لیتے،اونٹ کے پالان کا بستر بناتے اور اپنے سامان کے بیگ کو تکیے کے طور پر استعمال کر لیتے۔سفر حج میں ان کے ۱۶ دینار خرچ ہو گئے تو بیٹے سے کہا،ہم نے بہت اسراف کر لیا۔

امیر المومنین کو ہر وقت اپنی رعایا کی فکر رہتی تھی۔یہ ان میں حد درجہ پائی جانے والی خشیت الٰہی کا پرتو تھی۔فرماتے تھے،اگر کنار فرات کوئی اونٹ (یا کتا) بھی بھوک سے مر گیا تو مجھے ڈر ہے،آل عمر سے اس کا حساب لیا جائے گا۔اپنے گورنروں کی کارکردگی یہ سوالات پوچھ کر جانچتے،کیا وہ بیماروں کی تیمارداری کرتا ہے؟ غلاموں کی خبرگیری کرتا ہے؟ کم زور سے حسن سلوک کرتا ہے؟ کیا دروازے پر بیٹھتا ہے؟ (یعنی دربان تو نہیں مقرر کر رکھا؟) ان میں سے ایک سوال کا جواب بھی ناں میں ہوتا تو وہ گورنر کو معزول کر دیتے۔خلیفۂ دوم غیر مسلموں سے شفقت سے پیش آتے۔مدینہ میں ایک یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو سورۂ توبہ کی آیت 'انما الصدقات للفقراء والمساكين ...'(۶۰)

بلاشبہ صدقات (زکوٰۃ وخیرات) فقیروں، مسکینوں۔۔۔کا حق ہیں‘‘ پڑھی اور کہا، یہ تو مسکین ہے چنانچہ اس کا روزینہ مقرر کر دیا۔ سفر شام کے دوران میں بھی انھوں نے مال زکوٰۃ میں سے کئی غریب نصرانیوں کے وظیفے منظور کیے۔ شام کے ایک یہودی کی زمین ہتھیا کر مسجد بنالی گئی تھی۔ امیر المومنین نے مسجد گرا کر زمین اس کے مالک کو واپس دلائی۔ لبنان کے پروفیسر شکری قرداحی کے مطابق ۱۹۳۳ء تک اس یہودی کے گھر کا لوگوں کو علم تھا۔ حضرت عمر نے غیر مسلم اہل جزیہ کے تین درجے مقرر کیے، مال دار، متوسط اور غریب۔ سال میں ایک بار لیے جانے والے جزیہ کی مقدار ایک خاندان کے ایک دن کے اخراجات کے مساوی تھی۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور، راہب اور ایک سال تک فوجی خدمت انجام دینے والے غیر مسلم اس سے مستثنیٰ تھے۔ عہد رسالتؐ سے غیر مسلموں سے دہری چنگی (۵٪) وصول کی جاتی تھی۔ سیدنا عمر ایک بار جمعے کا خطبہ دے رہے تھے کہ ایک تغلبی نصرانی نے انھیں روک کر چنگی والوں کی کوئی شکایت کی۔ انھوں نے ’’نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا‘‘ کہہ کر اپنا خطاب جاری رکھا۔ نصرانی کو ان کی بات سمجھ نہ آئی، وہ جز بز ہو کر سرحد پر واپس پہنچا تو عمر کا حکم پہلے سے پہنچ چکا تھا۔

خلیفۂ ثانی نے سکہ سازی سرکاری کنٹرول میں لے لی تھی۔ پرانے سکہ ساز ملازمت پر برقرار رکھے گئے۔ حکومت خود بھی سکے ڈھالتی، لوگ بھی اپنا سونا چاندی لا کر اجرت پر ڈھلائی کرا لیتے۔ مغرب کے کئی عجائب گھروں میں اس وقت کے سکے موجود ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن کی تعلیم عام کرنے کے لیے طلبہ کو وظائف دیتے۔ کوفہ کی جامع مسجد میں عبداللہ بن مسعود تعلیم دیتے۔ انھیں خاص طور پر ہدایت تھی کہ قرآن بنو ہذیل کی طرز کی بجائے قریش کے فصیح لہجے میں پڑھیں۔ مسجد نبویؐ میں عقیل بن ابو طالب انساب اور ایام عرب کی تدریس کرتے۔ خلیفۂ دوم نے ابوالاسود دؤلی کو صرف ونحو مدون کرنے کا حکم دیا۔ مہاجرین وانصار کی موجودگی میں ہر عامل سے عہد لیتے، وہ ترکی گھوڑے پر نہ بیٹھے گا، چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا، باریک کپڑے نہ پہنے گا اور لوگوں کی حاجتوں کے آگے دربان نہیں بٹھائے گا۔ وہ ہر فوجی دستے کے ساتھ ترجمان اور طبیب بھیجتے۔

انھوں نے گھوڑوں کی افزائش نسل کی خصوصی ہدایت کی، جانوروں کو خصی کرنے سے منع کیا۔ عمر انھیں منہ پر مارنے اور ان پر حد سے زیادہ بوجھ لادنے سے روکتے۔ فوجیوں کو بھیجے جانے والے گھوڑے نقیع کی چراگاہ میں رکھے جاتے اور صدقے کے اونٹوں کے لیے ربذہ اور شرف کے سبزہ زار مخصوص تھے۔

ایک دن سیدنا عمر نہا دھو کر جمعہ کی نماز کو جا رہے تھے کہ ایک گھر کی بالائی منزل کے پرنالے سے گندا پانی ان پر

گرا۔ مضرت عامہ کا مداوا کرنے کے لیے انھوں نے یہ پرنالہ اکھڑوا دیا۔ یہ گھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کا تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اسے نصب فرمایا تھا تو حضرت عباس کو اپنے کندھے پر چڑھا کر اسے دوبارہ اس کی جگہ لگوایا۔

حضرت عمر نے عورتوں کا مہر کم از کم رکھنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے ان کو قبطی سوت سے بنے ہوئے کپڑے (قبطیہ) پہنانے سے منع کیا کیونکہ یہ ململ کی طرح باریک ہوتا تھا۔ جسم اگر اندر سے نہ جھلکتا تو بھی اس کی ہیئت نمایاں ہو کر رہتی۔

خلیفۂ ثانی نے قرضۂ حسنہ دینے کے لیے بیت المال میں ایک الگ شعبہ قائم کیا۔ اس بے سود قرضے سے کوئی کاروبار کرتا تو اس سے نصف منافع لیا جاتا۔ اگر خسارہ ہوتا تو وہ صرف اصل زر کا ضامن ہوتا۔ اس مد میں خود انھوں نے کئی بار قرض لیا، جب لوٹانے میں دیر ہوتی تو افسر بیت المال تقاضا کرتا اور انھیں فوراً ادائی کرنا پڑتی۔ وقت وفات سرکاری خزانے کو ان سے ۸۰ ہزار سے زائد درہم مطلوب تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی، یہ رقم فوری طور پر جمع کرائی جائے۔ معاقل (دیت و تاوان) کا نظام عہد نبویؐ (اھ) سے رائج تھا، عمر نے اس کو وسعت دی۔ کسی شخص سے اتفاقاً قتل ہو جاتا اور اسے خون بہا دینا ہوتا یا کوئی مسلمان دشمن کے ہاتھوں قید ہو جاتا تو اسے فدیہ دے کر چھڑانا ہوتا تو متعلقہ شخص کے غریب ہونے کی صورت میں اس کا قبیلہ یہ خطیر رقم (۱۰۰ اونٹ) ادا کرتا۔ عہد فاروقی میں متعلقہ چھاؤنی یا دیوان کے افراد اپنے رفیق کی مدد کو آتے۔

عمر کے داماد نے ان سے سوال کیا تو اسے جھڑک دیا۔ پوچھا گیا، آپ نے اسے رد کیوں کیا؟ فرمایا، اس نے مجھ سے اللہ کا مال مانگا تھا جس میں میں خیانت نہیں کر سکتا۔ میرا مال مانگا ہوتا تو اور بات ہوتی۔ پھر ۱۰ ہزار درہم اسے بھجوا دیے۔ حضرت عثمان فرماتے تھے، عمر اللہ کی رضا کے لیے اپنے اعزہ و اقارب کو محروم رکھتے تھے اور میں رضائے الٰہی کے حصول کے لیے انھیں عطیات دیتا ہوں۔

عمر میں غیرت ایمانی حد درجہ پر تھی۔ بشر نامی ایک منافق کا کسی یہودی سے جھگڑا ہوا تو ان دونوں کا مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ آپؐ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ منافق راضی نہ ہوا، اس نے کہا، چلو! عمر بن خطاب کو حکم بناتے ہیں۔ یہودی نے ان کو بتایا، ہمارا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا ہے لیکن یہ اس سے مطمئن نہیں۔ عمر نے بشر سے پوچھا، کیا یہی بات ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے کہا، تم یہیں کھڑے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔ اندر سے تلوار سونت کر نکلے اور منافق کی گردن اڑا کر کہا، جو اللہ اور رسولؐ کے فیصلے

سے راضی نہ ہو، میں اس کا یہی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا قلبی تعلق اور ان کی محبت اس بات سے عیاں ہوتی ہے کہ فرمایا، میں نے کلثوم بنت علی مرتضٰی سے نکاح کیا ہے حالانکہ مجھے عورتوں کی حاجت نہیں۔اس لیے کہ میرا آپؐ سے نسبی تعلق قائم ہو جائے۔ہو سکتا ہے، روز قیامت یہ آپؐ کے ارشاد کے مطابق میرے کام آ جائے۔

۱۳ھ میں حضرت عمر خلیفہ بنے، اس سال انھوں نے حضرت عبدالرحمان بن عوف کو اپنی جگہ امیر حج بنا کر بھیجا۔ پھر خلافت کے مسلسل ۱۰ سال وہ لوگوں کے ساتھ حج ادا کرتے رہے۔۲۳ھ میں اپنے آخری حج میں وہ امہات المومنین کو ساتھ لے کر گئے۔انھوں نے اپنے عہد خلافت میں ۳ عمرے کیے، رجب ۱۷ھ، رجب ۲۱ھ اور رجب ۲۲ھ میں۔ مقام ابراہیمؑ بیت اللہ سے متصل تھا، انھوں نے اسے ذرا پیچھے کر دیا جہاں یہ آج کل ہے۔۲۳ھ کے حج میں وہ منیٰ سے واپس ہوئے تو ریگزار (بطحاِ مکہ) میں ایک جگہ اونٹ کو بٹھایا، ریت کا ٹیلا سا بنا کر اس پر لیٹ گئے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی، اے اللہ! میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، قویٰ کمزور پڑ گئے ہیں (یا ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں) اور میری رعایا بڑھ گئی ہے، اس سے پیشتر کہ میں کوئی کمی و کوتاہی کروں مجھے اپنے پاس بلا لے۔انھوں نے یہ دعا بھی مانگی، اللہ! میں تیری راہ میں شہید ہونا اور تیرے رسولؐ کے شہر میں دم دینا چاہتا ہوں۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا عیسائی غلام ابولؤلؤہ فیروز فارسی عصبیت رکھتا تھا، مدینہ میں ایرانی غلاموں کو دیکھ کر اسے دکھ ہوتا۔ایک بار اس نے حضرت عمر کو راستے میں روک لیا اور کہا، مغیرہ سے سفارش کریں کہ میرا لگان کم کر دیں۔ انھوں نے پوچھا، لگان ہے کتنا؟ اس نے بتایا، ۲ (یا ۴) درہم یومیہ۔پھر سوال کیا، کام کیا کرتے ہو؟ وہ ترکھان، لوہار اور نقش گر تھا اور چکیاں بھی بناتا تھا، آخری کام ہی اس نے بتایا اور باقیوں کا ذکر نہ کیا۔عمر نے پوچھا، کتنے کی چکی بنا لیتے ہو؟ اور کتنے کی بیچتے ہو؟ اس کی تفصیل سن کر انھوں نے کہا، تب تو خراج زیادہ نہیں۔وہ رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا، ہمیں ہوا سے چلنے والی چکی نہ بنا دو گے؟ اس نے جواب دیا، اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا کہ عالم شرق و غرب میں اس کی مثال دی جایا کرے گی۔عمر نے کہا، اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔یہاں سے ابولؤلؤہ ہرمزان اور جفینہ کے پاس پہنچا اور ان سے ایک خنجر مستعار لیا۔عبدالرحمان بن ابوبکر کا وہاں سے گزر ہوا تو وہ گھبرایا اور خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا تاہم انھیں اس کے عزائم کا اندازہ نہ ہو سکا۔اگلے روز کعب احبار امیر المومنین کے پاس آئے اور کہا، ۳ دنوں میں آپ وفات پا جائیں گے۔انھوں نے پوچھا، تمھیں کیسے پتا چلا؟ کعب نے بتایا، میں نے تورات میں پڑھا ہے۔عمر حیرت سے بولے، اللہ رے! تو نے عمر بن خطاب کا ذکر تورات میں پا لیا؟ انھوں

نے کہا، نام تو نہیں لیکن حلیہ اور صفات آپ ہی کی ہیں۔ عمر خاموش ہو گئے اور کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ جب کعب نے کہا، آپ دعا کریں، ہوسکتا ہے، اللہ آپ کو اور مہلت دے دے تو انھوں نے اللہ سے التجا کی، مجھے اس حال میں اٹھا لے کہ مجھ میں کوئی وہن ہو نہ نشانۂ ملامت بنوں۔ شہادت سے پہلے انھوں نے خواب دیکھا، ایک سرخ مرغ نے ان کوٹھونگے مارے ہیں۔ انھوں نے اس کی یہی تعبیر سمجھی کہ کوئی عجمی ان کو قتل کرے گا۔

بدھ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کی فجر ہوئی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے مسجد نبوی میں آئے۔ ابھی صفیں سیدھی نہ ہوئی تھیں کہ ابولؤلؤہ نے کٹار سے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ اس نے چھ وار کیے، ایک زیر ناف لگا جو مہلک ثابت ہوا۔ عمر چلائے، اس کتے کو پکڑو! اس نے مجھے قتل کر دیا ہے اور قرآن کی آیت ''وکان امر اللہ قدراً مقدوراً، اللہ کا حکم وہ تقدیر ہے جو پوری ہو کر رہتی ہے'' (احزاب ۳۸) پڑھتے ہوئے گر پڑے۔ لوگ اس کی طرف لپکے، اس نے خنجر گھمایا اور ۱۲ مزید افراد کو شدید زخمی کر دیا جن میں سے ۶ (یا ۹) اسی موقع پر شہید ہو گئے، باقیوں نے بعد میں جان دی۔ عبد اللہ بن عوف نے اس پر اپنا چغہ ڈال کر اسے قابو کیا۔ گرفت میں آنے سے پہلے وہ اپنے خنجر پر گرا اور اپنی جان بھی لے لی۔ عمر کو معلوم ہوا کہ ان کا قاتل ابولؤلؤہ ہے تو فرمایا، اللہ کا شکر ہے، میں ایسے شخص کے ہاتھوں مارا جا رہا ہوں جس نے اللہ کے حضور ایک سجدہ بھی نہیں کیا۔ وہ کلمۂ لا الٰہ پڑھ کر میرے خلاف کوئی حجت نہیں پیش کر سکتا۔ اسی ہنگامے میں دن چڑھنے کو تھا کہ انھوں نے عبدالرحمان بن عوف کو بلا کر نماز پڑھانے کو کہا۔ عبدالرحمان نے سورۂ عصر اور سورۂ کوثر (یا نصر و عصر) کی تلاوت کر کے مختصر نماز پڑھائی۔ عمر بے ہوش ہو گئے تو انھیں اٹھا کر گھر لے جایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی دوبارہ تسلی کی کہ اہل ایمان نماز پڑھ چکے ہیں؟ فرمایا، اس شخص کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں جس نے نماز ضائع کی پھر خود بھی اس حال میں وقت پر نماز ادا کی کہ زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے زندگی کی باقی دو نمازیں بھی انھی کپڑوں میں ادا کیں۔ سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس آئے تو ان سے کہا، منادی کرا کے لوگوں سے پوچھو! کیا یہ قاتلانہ حملہ ان کے مشورے سے ہوا ہے؟ سب نے اس عمل شنیع سے اللہ کی پناہ مانگی اور کہا، ہم تو دعا گو ہیں اللہ ہماری عمر بھی آپ کو لگا دے۔ اب بنو حارث کا طبیب آیا، اس نے عمر سے مشورہ کر کے انھیں نبیذ (شربت کھجور) پلائی تو وہ زخموں سے باہر نکل آئی، دوسرا طبیب ابو معاویہ سے تھا، اس نے دودھ دیا تو وہ بھی خارج ہو گیا۔ انھیں بتا دیا گیا، جانبری کی امید نہیں۔ رات ہونا بھی مشکل ہے، جو ضروری کام نمٹانا چاہتے ہیں نمٹا لیں۔ انھوں نے لوگوں کو اپنے پاس رونے پیٹنے سے منع کر دیا۔ میری ماں ہلاک ہو، اگر اللہ میری بخشش نہ کرے۔

خلیفۂ ثانی نے اپنے قرض کے بارے میں پوچھا۔ انھیں بتایا گیا، ان کے ذمہ ۸۶ ہزار درہم واجب الادا ہیں تو

اپنے بیٹوں کو اپنا مال بیچ کر فوراً قرض اتارنے کی وصیت کی۔ کہا، اگر آل عمر سے ادا نہ ہوا تو بنو عدی بن کعب سے لینا، اگر ان سے بھی پورا نہ ہوا تو قریش سے وصول کرنا، ان کے بعد کسی سے نہ مانگنا۔ عبداللہ بن عمر نے ایک ہفتے کے اندر اندر یہ قرضہ چکا دیا۔ ایک نصرانی (یا مجوسی) غلام کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنے کی وجہ سے انھیں اندیشہ ہوا کہ غیرمسلم شہری انتقام کا نشانہ نہ بن جائیں اس لیے غیر مسلموں سے حسن سلوک کی خاص طور پر تاکید کی۔ ابتدائے خلافت میں حضرت عمر نے مرتدین کے جنگی قیدی ان کے کنبوں میں واپس بھیج دیے تھے۔ وقت شہادت بھی وہ بے بس غلاموں کو نہ بھولے۔ انھوں نے اپنے سارے غلام آزاد کرنے کا اعلان کرنے کے ساتھ باقی تمام عرب قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم بھی دیا۔ ان کا بدل بیت المال سے ادا کیا گیا۔ جانشینی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ مشاورت کے لیے انھوں نے حضرت عبدالرحمان بن عوف کو بلایا تو وہ سمجھے، خلافت مجھے سونپنا چاہتے ہیں۔ کہا، واللہ! میں اس کام میں نہ پڑوں گا۔ عمر کئی بار کہہ چکے تھے، اگر ابوعبیدہ بن جراح یا ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم زندہ ہوتے تو انھیں بے دھڑک خلیفہ مقرر کر دیتا۔ حضرت علی کو ترجیح دینے کے باوجود نامزد نہ کیا کیونکہ وہ ان کے سسر تھے۔ آخرکار فرمایا، ان ۶ آدمیوں کو بلاؤ جن سے رسول اللہ صلی علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے راضی تھے۔ یہ اصحاب عشرۂ مبشرہ میں سے ۶ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر بن عوام، حضرت طلحہ بن عبیداللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمان بن عوف تھے۔ عمر نے ان میں سے ساتویں زندہ صحابی سعید بن زید کو اس وجہ سے خارج کر دیا کہ وہ ان کے قبیلہ بنوعدی سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کا نام لیتے ہوئے بطور خاص فرمایا، میں نے انھیں ان کے کسی قصور یا خیانت کی وجہ سے معزول نہ کیا تھا۔ طلحہ اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے۔ عمر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس شرط پر شامل کیا کہ وہ منتخب نہ کیے جائیں۔ ان کو ہدایت کی، ووٹ برابر ہونے کی صورت میں اپنا فیصلہ کن ووٹ اس بزرگ کو دیں جسے عبدالرحمان منتخب کرنا چاہتے ہوں۔ خلیفہ کا انتخاب ہونے تک صہیب بن سنان کو امام مقرر کیا۔ انھوں نے ابوطلحہ انصاری کو اپنا نائب بنا کر حکم دیا، کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس گھر کے دروازے پر پہرہ دینا جہاں خلیفہ کا انتخاب ہو رہا ہو۔ کسی کو اندر نہ جانے دینا اور مجلس انتخاب کو ۳ دن سے زیادہ مہلت نہ دینا۔ اگر کسی نے مسلمانوں کی مرضی کے بغیر ان پر مسلط ہونے کی کوشش کی تو اس کی گردن اڑا دینا۔

عمر نے اپنے جانشین کو وصیت کی، مہاجرین کے حقوق کا خیال رکھے، انصار سے اچھا برتاؤ کرے، اپنے رشتہ داروں کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دے۔ شہریوں سے زیادہ ٹیکس نہ لے، بدوؤں سے حسن سلوک کرے، ان کی زکوٰۃ انھی کے فقرا میں بانٹ دے۔ ذمیوں سے کیے ہوئے معاہدے پورا کرے، ان کی حفاظت کرے اور ان پر زیادہ

بوجھ نہ ڈالے۔انھوں نے خواہش کی،ان کے مقرر کردہ گورنر ایک سال تک برقرار رکھے جائیں۔بعدازاں حضرت عثمان نے اس ہدایت پر عمل کیا۔حضرت عمر نے دادا اور کلالہ کی وراثت کے بارے میں اپنی راے شانے کی ایک ہڈی (scapula) پر تحریر کر رکھی تھی۔شاید انھیں اس پر پورا اطمینان نہ تھا اس لیے اپنے بیٹے سے کہہ کر وہ ہڈی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اپنی تحریر مٹائی۔خلیفۂ دوم نے عبداللہ کو ام المومنین سیدہ عائشہ کے پاس بھیجا اور فرمایا،ان سے کہنا،عمر سلام کہتا ہے،امیر المومنین نہ بولنا۔پھر ان سے اجازت مانگنا،انھیں ان کے دونوں ساتھیوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دفن کرنے کی اجازت دے دی جائے۔حضرت عائشہ اپنے حجرے میں بیٹھی رو رہی تھیں۔عمر کی درخواست سن کر فرمایا،وہ جگہ میں نے اپنے لیے رکھی تھی لیکن اب عمر کو اپنے پر ترجیح دوں گی۔عمر نے عبداللہ سے کہا،میری میت جب حجرۂ عائشہ پہنچے تو دوبارہ اذن مانگنا۔اگر انھوں نے اس وقت منع کر دیا تو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفنا دینا۔انھوں نے میت کو مشک لگانے سے منع کیا۔

آخری لمحات میں حضرت عمر پر خشیت الٰہی پوری طرح غالب آ گئی۔انھوں نے بار بار کہا،اگر پوری زمین میری ملک ہوتی تو اسے آنے والی ہولناکی کے بدلے فدا کر دیتا۔پھر بستر سے ہاتھ بڑھا کر ایک تنکا اٹھایا اور کہا،کاش میں یہ تنکا ہی ہوتا اور میری ماں مجھے نہ جنتی۔عبداللہ بن عباس نے تسلی دی،آپ نے کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیے اور انصاف سے تقسیم کی۔عمر نے فرمایا،اس بات کی شہادت دو۔حاضرین میں سے کسی نے کہا،آپ کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی۔انھوں نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا،میرا رخسار زمین پر رکھ دو۔انھوں نے پس و پیش کی تو انھیں ڈانٹا۔جب ان کے حکم کے مطابق رخسار زمین سے لگا دیا گیا تو پاؤں رگڑ کر آہ و زاری کی،میری ماں ہلاک ہوا گر اللہ نے میری بخشش نہ کی۔بار بار یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل رہے تھے کہ ان کی روح پرواز کر گئی۔

بدھ ۲۶ ذی الحجہ (ابن کثیر: ہفتہ) کی شام سیدنا عمر نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔جمعرات ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ھ (ابن کثیر کے خیال میں اتوار یکم محرم ۲۴ھ) کی صبح ان کا جنازہ حجرۂ عائشہ میں لے جایا گیا تو انھوں نے دوبارہ اجازت دی،سلامتی سے آ جائیے۔حضرت صہیبؓ بن سنان نے مسجد نبویؐ میں نماز جنازہ پڑھائی۔عصا سے عمر کا قد ماپ کر قبر کھودی گئی،حضرت ابوبکر کا سر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں کے برابر تھا،حضرت عمر کا ان کے کندھوں کے برابر رکھا گیا۔یوں جگہ تنگ ہو گئی تو حجرے کی دیوار میں نقب لگا کر پاؤں رکھے گئے۔ولید بن عبدالملک کے عہد میں یہ دیوار گری تو حضرت عمر کا پاؤں نظر آنے لگا۔حضرت صہیب،حضرت علی،حضرت عثمان،حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت عبداللہ بن عمر نے میت کو قبر میں اتارا۔طلحہ بن عبیداللہ تدفین میں بھی شامل نہ ہو سکے۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف نے آلۂ قتل چھرا بتایا جو انھوں نے پہلے ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا پھر حضرت عمر کی شہادت کے وقت ابولؤلؤہ کے پاس سے ملا۔ عبدالرحمان بن ابوبکر کے بیان کے مطابق وہ دو دھاری خنجر (کٹار) تھا جو ابولؤلؤہ کے ہاتھ سے اس وقت گرا تھا جب وہ ہرمزان اور جفینہ سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ یہی زیادہ مشہور ہے۔ عبیداللہ بن عمر نے قتل کی سازش میں ان دونوں کی شرکت کا سنا تو گلے میں تلوار لٹکا کر نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے ہرمزان کو بلا کر اس پر وار کیا، اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے جان دی پھر پیشانی پر تلوار چلا کر جفینہ کو قتل کیا۔ عبیداللہ نے جوش غضب میں ابولؤلؤہ کی چھوٹی بچی بھی مار رڈالی جو مسلمان تھی اور کہا، یہ اجنبی فساد کی جڑ ہیں۔ وہ مدینہ میں موجود تمام عجمیوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے کہ عبدالرحمان بن عوف اور دوسرے اہل ایمان نے انھیں قابو کر کے قید کر دیا۔ سیدنا عثمان نے خلیفہ بنتے ہی عبیداللہ کو بلایا، وہ انھیں قصاص میں قتل کرنا چاہتے تھے کیونکہ انھوں نے دو مسلمانوں اور ایک ذمی کی جان لی تھی۔ حضرت علی نے ان کی تائید کی لیکن باقی مسلمانوں نے کہا، کل عمر شہید ہوئے، آج ان کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے؟ عمرو بن عاص نے مشورہ دیا، یہ قتل خلیفۂ ثالث کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہو چکے تھے اس لیے ان پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ پھر بھی حضرت عثمان نے ہرمزان کے بیٹے سے قصاص لینے کو کہا لیکن اس نے معاف کر دیا۔ انھوں نے جفینہ اور ابولؤلؤہ کی بیٹی کی دیت اپنی جیب سے ادا کر دی۔

محمد حسین ہیکل کہتے ہیں، محض ابولؤلؤہ کے خراج کا زیادہ ہونا اور عمر کا اس کی سفارش نہ کرنا ان کی جان لینے کا باعث نہیں ہوسکتا۔ ایک ایرانی نے عمر کو قتل کی دھمکی دی، ایک یہودی نے انھیں تنبیہ کی اور اس سازش کے پس منظر میں ایک اور ایرانی اور ایک عیسائی شریک تھے۔ اس طرح یہ عمر رضی اللہ عنہ کو منظر سے ہٹا کر مسلمانوں کی جمعیت منتشر کرنے کا سہ فریقی منصوبہ تھا جو فوری طور پر کامیاب نہ ہوا۔ مسلمانوں میں خانہ جنگی ہوئی اور خلافت کا شیرازہ بکھر گیا تو یہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مجلس انتخاب کا اجلاس ہوا تو اولاً یہ معلوم کیا گیا کہ کون خلیفہ بننے کی خواہش نہیں رکھتا۔ حضرت عثمان اور حضرت علی کے علاوہ باقی چاروں اصحاب رسولؐ یہ منصب نہ چاہتے تھے۔ زبیر علی کے اور طلحہ عثمان کے حق میں دست بردار ہو گئے، سعد نے اپنا اختیار عبدالرحمان کو سونپ دیا جو خود بھی پیچھے ہٹ چکے تھے۔ انھی کی ذمہ داری لگی کہ وہ عثمان و علی میں سے ایک کو منتخب کر لیں۔ بنو ہاشم حضرت علی کو خلیفہ بنانے چاہتے تھے جب کہ قریش کی باقی شاخیں چاہتی تھیں، نبوت و خلافت ایک ہی خاندان میں اکٹھی نہ ہوں۔ عبدالرحمان نے ممکن حد تک سب اہل ایمان سے مشورہ کیا، انفرادی اور اجتماعی طور پر، پوشیدہ اور علانیہ حتیٰ کہ وہ عورتوں، بچوں اور مدینہ میں وارد ہونے والے مسافروں کے پاس بھی گئے۔

ایک جم غفیر نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا تو انھوں نے بھی یہی فیصلہ کر لیا۔ اعلان کرنے سے پہلے انھوں نے انھوں نے حضرت علی سے پوچھا، اگر آپ کو خلافت نہ ملی تو آپ کے خیال میں یہ ذمہ داری کسے اٹھانی چاہیے؟ انھوں نے جواب دیا، عثمان کو۔ یہی بات انھوں نے حضرت عثمان سے پوچھی تو انھوں نے حضرت علی کا نام لیا۔ انھوں نے ان دونوں سے اقرار لیا کہ وہ منتخب خلیفہ کی پوری اطاعت کریں گے۔ منبر رسولؐ پر چڑھ کر ان دونوں سے پھر پوچھا، کیا وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور شیخین ابوبکر و عمر کے عمل کے مطابق کام کریں گے؟ ان کے اقرار کے بعد عبدالرحمان بن عوف نے حضرت عثمان کا ہاتھ تھاما، آسمان کی طرف سر اٹھا کر اللہ کو گواہ بنایا اور کہا، میں نے یہ ذمہ داری عثمان کو سونپ دی ہے۔ بیعت عامہ اس کے بعد ہوئی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی عمر ۶۰ سال ہوئی، ۵۳، ۵۵ سے لے کر ۶۳ سال تک مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ ان کا دور خلافت ۱۰ سال ۵ مہینے ۲۱ (دوسرا قول: ۱۰ سال ۶ ماہ ۴ دن) دن رہا۔ انھوں نے زمانۂ جاہلیت میں تین شادیاں کیں، (۱) زینب بنت مظعون جن سے عبداللہ، عبدالرحمان (اکبر) اور حفصہ پیدا ہوئے۔ (۲) ملیکہ بنت جرول جن سے عبیداللہ اور زید (اصغر) نے جنم لیا۔ ملیکہ نے اسلام قبول نہ کیا اور نکاح فسخ ہونے کے بعد ابوجہم بن حذیفہ سے شادی کر لی۔ ابن سعد نے ان کا نام کلثوم بنت جرول بتایا ہے۔ (۳) قریبہ بنت ابوامیہ جو بے اولاد اور غیر مسلم رہیں۔ بعد میں عبدالرحمان بن ابوبکر کی زوجیت میں آئیں۔ قبول اسلام کے بعد عمر کی ۴ شادیاں ہوئیں۔ (۱) ام حکیم بنت حارث جن سے فاطمہ کی ولادت ہوئی۔ کہا جاتا ہے، ان کو طلاق دے دی تھی۔ (۲) جمیلہ بنت ثابت جن کا نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عاصیہ سے تبدیل کر کے جمیلہ رکھا تھا۔ ان سے عاصم متولد ہوئے۔ انھیں بھی طلاق دے دی (۳) ام کلثوم جو حضرت علی اور سیدہ فاطمۃ الزہرا کی بیٹی تھیں۔ ان سے زید (اکبر) اور رقیہ پیدا ہوئے۔ (۴) عاتکہ بنت زید جو عمر سے پہلے عبداللہ بن ابوبکر سے اور ان کی شہادت کے بعد زبیر بن عوام سے بیاہی گئیں۔ ان سے عیاض متولد ہوئے۔ یمن سے تعلق رکھنے والی لھیّہ ام ولد تھیں، ان سے عبدالرحمان (اوسط) نے جنم لیا۔ عبدالرحمان (اصغر) دوسری ام ولد سے پیدا ہوئے۔ فکیھہ بھی ام ولد تھیں، ان سے عمر کی سب سے چھوٹی بیٹی زینب کی ولادت ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم بنت ابوبکر کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انھوں نے انکار کر دیا اور کہا، آپ سخت زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ حضرت عائشہ کی ترغیب پر بھی آمادہ نہ ہوئیں۔

حضرت عمر بالوں پر مہندی لگاتے تھے۔ ان کی انگوٹھی پر نقش تھا، کفی بالموت واعظاً یا عمر، اے عمر! موت کا نصیحت گر ہونا ہی کافی ہے۔ کپڑوں پر اکثر و بیشتر چار چار رنگ برنگے پیوند لگے ہوتے۔ سائب بن یزید کہتے ہیں، قحط کے سال

میں نے ان کے تہ بند پر ١٦ پیوند گنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''اگر میرے بعد نبی آنا ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔'' (ترمذی:٣٦٨٦) کچھ صحابہ کا خیال تھا، علم کا ٩/١٠ حصہ عمر کے پاس اور باقی ١/١٠ دوسرے لوگوں کے پاس ہے۔ حضرت عائشہ نے کسی کے استفسار پر بتایا، عمر کو فاروق کا لقب نبی صلی اللہ علیہ سلم نے عطا فرمایا۔ آپؐ کا ارشاد ہے، ''اللہ نے عمر کی زبان اوران کے دل پر حق جاری کر دیا ہے۔'' (ترمذی:٣٦٨٢) آپؐ نے عمر کو مخاطب کر کے فرمایا، ''شیطان تم سے ڈرتا ہے، عمرؓ!'' (ترمذی ٣٦٩٠) ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''میرے دو وزیر آسمانوں میں رہتے ہیں اور دو وزیروں کا تعلق زمین سے ہے۔ آسمانی وزیر جبریل و میکائیل اور زمینی ابوبکر و عمر ہیں۔'' (ترمذی:٣٦٨٠، سند میں ضعف ہے) یہ فرمان نبویؐ تو ہر مسلمان نے جمعہ کے خطبات میں سنا ہو گا، ''میری امت میں امت کا سب سے بڑھ کر ترس کھانے والے ابوبکر ہیں اور ان میں اللہ کے دین کے معاملے میں سب سے زیادہ شدت رکھنے والے عمر ہیں۔'' (مسند احمد:١٣٩٩٠) حذیفہ بن یمان روایت کرتے ہیں، ہم ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ نے فرمایا، ''میں نہیں جانتا، میں تمھارے ساتھ کتنی دیر رہ پاؤں گا۔ میرے بعد ان دونوں کی پیروی کرنا۔'' آپؐ نے ابوبکر و عمر کی طرف اشارہ فرمایا۔ (مسند احمد:٢٣٢٧٦) یہ وہ عمر تھے جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنی آدھی جائیداد دے دی تھی اور خیبر میں زرخیز زمین خرید کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے اسے وقف کر دیا تھا۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے اپنے قبیلے کے کسی شخص کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش میں شریک نہ ہونے دیا۔ غزوۂ بدر میں بھی ان کے قبیلے کا ایک کافر بھی نہ آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ''میں ابوبکر کے بعد اس امت کے بہترین آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ فرمایا، وہ عمر ہیں۔ (مسند احمد:٨٣٣) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''میں (خواب کے اندر) جنت میں داخل ہوا تو ایک محل دیکھا، پوچھا، یہ کس کا ہے؟ فرشتوں نے بتایا، یہ عمر کا ہے۔'' (مسلم ٦١٩٨)

عمر کے چند اقوال: قوت کا راز اسی میں ہے کہ آج کا کام کل پر نہ ٹالو۔ امانت اس چیز کا نام ہے کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر کے خلاف نہ ہو۔ اللہ سے ڈرو! تقویٰ کوشش سے حاصل ہوتا ہے۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسی کو بچاتا ہے۔ عمر کو معلوم ہوا، قریش کے کچھ افراد لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتے ہیں تو فرمایا، آپس میں ملاقاتیں کرتے رہو اور اپنی نشستیں عام کر دو۔ اسی طرح تمھاری باہمی الفت برقرار رہ سکتی ہے۔ کسی شخص کا ذکر ان کے سامنے یوں ہوا، وہ اتنا صاحب فضل ہے کہ برائی کو جانتا تک نہیں۔ کہا، تب تو ضرور برائی میں جا پڑے گا۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الاستیعاب

فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (شاہ ولی اللہ دہلوی)، الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: ڈاکٹر حمید اللہ)

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کے ایک باب کا خلاصہ ہے، جس میں نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

خور و نوش

دین ہر پہلو سے نفس انسانی کا تزکیہ چاہتا ہے، اِس لیے اُسے اِس بات پر ہمیشہ اصرار رہا ہے کہ باطن کی تطہیر کے ساتھ کھانے اور پینے کی چیزوں میں بھی خبیث و طیب کا فرق ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ انسان کی فطرت اِس معاملے میں بالعموم اُس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ کیا چیز طیب اور کیا خبیث ہے۔ وہ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گد، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اِن جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں بھی اُس کی عقل عام طور پر صحیح نتیجے پر پہنچتی ہے۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے اِس معاملے میں انسان کو اصلاً اُس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔

انسان کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کی ایک بڑی تعداد اِس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ شریعت نے اِس طرح کی کسی چیز کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ اِس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور اُن کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل و فطرت کی

رہنمائی میں کر لینا انسانوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن وہ درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اُسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے گا یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں، اگر تذکیے کے بغیر مر جائیں تو اُن کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ اِنھی جانوروں کا خون کیا اِن کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا اُسے حلال وطیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ اِن سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اُسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو اُن سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اِس حکم کی جو توضیحات قرآن میں بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ طبعی موت سے مرے ہوئے اور ناگہانی حوادث سے مرے ہوئے جانور میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، یہ دونوں یکساں مردار ہوں گے۔ کسی درندے کا پھاڑا ہوا جانور بھی مردار ہے، اِلّا یہ کہ اُسے زندہ پا کر ذبح کر لیا گیا ہو۔

۲۔ سدھایا ہوا جانور اگر شکار کو پھاڑ دے اور شکار ذبح کی نوبت آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے تو اِس طرح کے جانور کا اُسے پھاڑنا ہی اُس کا تذکیہ ہے، لہٰذا اُسے ذبح کیے بغیر کھایا جا سکتا ہے۔ تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُسے اپنے مالک کے لیے روک رکھے۔ اُس میں سے جانور نے اگر کچھ کھا لیا ہے تو اُس کا شکار جائز نہ رہے گا۔

۳۔ وہ جانور بھی حرام ہے جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا، لیکن اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، وہ بھی اِسی کے تحت ہے۔ یہی معاملہ اُس ذبیحہ اور صید کا ہے جس پر اللہ کا نام لیا گیا، مگر نام لینے والا اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا یا مانتا تو ہے، لیکن خداؤں کی انجمن میں ایک رب الارباب کی حیثیت سے مانتا ہے اور شرک ہی کو اصلاً اپنا دین قرار دیتا ہے۔

۴۔ اِن محرمات سے استثنا صرف حالت اضطرار کا ہے اور وہ بھی اِس طرح کہ آدمی نہ خواہش مند ہو، نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھنے والا ہو۔

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق اور شعبۂ تعلیم و تربیت کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

جہیز میراث کا حصہ

سوال: ہمارے معاشرے میں عام طور پر بیٹیوں کو ماں باپ کی وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان کے بھائی چاہتے ہیں کہ اپنے ماں باپ کی ساری میراث پر وہی قبضہ کر لیں، اس کے لیے وہ درج ذیل دو دلائل خاص طور پر پیش کرتے ہیں:

پہلا یہ کہ بہنوں کو چاہیے کہ وہ اپنی خوشی سے اپنا حصہ اپنے بھائیوں کے لیے چھوڑ دیں، کیا انھیں اپنے بھائیوں کا خیال نہیں ہے؟

دوسرا یہ کہ لڑکیوں کی شادیوں پر چونکہ ان کے والدین اور بھائیوں نے اخراجات بھی کیے ہیں اور انھیں جہیز بھی دیا ہے۔ لہٰذا ایک طرح سے وہ اپنا حصہ لے چکی ہیں اور اب ان کا میراث کا مطالبہ درست نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا بھائیوں کا یہ رویہ درست ہے اور کیا جہیز کو میراث کے حصے کا بدل کہا جا سکتا ہے؟ (فوزیاب اسلم)

جواب: ہمارے معاشرے میں یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ صرف بھائی ہی نہیں والدین بھی بیٹیوں کو اپنی میراث سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی زندگی ہی میں طرح طرح کے حیلے بہانے اختیار کرتے ہیں۔

بہر حال، لڑکیوں کو میراث سے ان کے بھائی محروم رکھنا چاہیں یا ان کے والدین اپنی زندگی ہی میں اس کا کوئی حیلہ اختیار کریں، دونوں صورتوں میں یہ بات سرتا سر ظلم ہے اور خدا کے ہاں اس کی جواب دہی ہوگی۔ والدین کی میراث میں خدا نے جیسے بیٹوں کا حصہ رکھا ہے، اسی طرح بیٹیوں کا حصہ بھی رکھا ہے۔ حصہ کی مقدار کا فرق تو ضرور ہے، لیکن حصہ دار ہونے میں دونوں کو ایک جیسی حیثیت حاصل ہے۔ جو شخص کسی وارث کی اس حیثیت کو عملاً بدلتا ہے، وہ خدا کے فیصلے کو ناپسند کرتا اور اسے بدلتا ہے اور یہ چیز بہت بڑا جرم ہے۔ سورۂ نساء میں میراث کے سارے حصے بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (۴:۱۳-۱۴)

''یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی حدیں ہیں، (اِن سے آگے نہ بڑھو) اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کریں گے، اُنھیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اُس کی ٹھیرائی ہوئی حدوں سے آگے بڑھیں گے، اُنھیں ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور اُن کے لیے رسوا کر دینے والی سزا ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ خدا کی طرف سے میراث کے یہ طے شدہ حصے خدا کی حدیں ہیں۔ ان حصوں کو بدلنا یا انھیں پامال کرنا خدا کی حدوں کو توڑنا ہے اور جو خدا کی حدوں کو توڑے گا، اس کے لیے ایسی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب ہوگا۔

جہیز کا میراث کے حصے سے کوئی تعلق نہیں۔ جہیز ایک معاشرتی رسم ہے۔ لڑکی کو ماں باپ کے جہیز دینے سے اس (لڑکی) کے حصے کی میراث میں سے ایک پائی بھی ادا نہیں ہوتی، لہٰذا وہ جہیز دیں یا نہ دیں، انھیں میراث میں حصہ دینا ہوگا۔

عورت کے سفر حج کے لیے محرم کی شرط

سوال: میں حج پر جانا چاہتی ہوں، لیکن محرم رشتہ داروں میں سے کوئی ساتھ نہیں جا سکتا، البتہ ایک قابل اعتماد فیملی جن کے بچے میرے شاگرد رہے ہیں، وہ مجھے اپنے ساتھ حج پر لے جا سکتی ہے۔ کیا اسلام کی رو سے اس فیملی کے ساتھ میرا حج پر جانا درست ہوگا؟ (صغریٰ بیگم)

جواب: اس زمانے میں حج کا سفر بہت محفوظ ہو گیا ہے، لہٰذا پرانے زمانے کے غیر محفوظ سفروں کی وجہ سے عورت کے لیے محرم کے ساتھ ہونے کی جو ہدایت دی گئی تھی، اب ان حالات میں اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔

محرم کی شرط کے معاملے میں ائمہ اربعہ میں اختلاف موجود ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک اگر عورت کو محفوظ رفاقت میسر آ جائے تو وہ حج کے لیے جا سکتی ہے، اس کے ساتھ محرم کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ محرم کے وجود کو لازم قرار دیتے ہیں۔

غامدی صاحب کی رائے کے مطابق آپ جس قابل اعتماد فیملی کے ساتھ حج پر جانا چاہتی ہیں، اس کے ساتھ جا سکتی ہیں، کسی محرم کے ساتھ ہونے کی شرط لازم نہیں ہے۔

شراب کی حرمت کی بنیاد

سوال: قرآن مجید میں چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ان میں شراب شامل نہیں ہے۔ شراب کے بارے میں بس یہ کہا گیا ہے کہ تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس کے علاوہ شراب سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن ایسا کیوں ہے کہ مسلمان شراب کو خدا کی حرام کردہ دوسری سب چیزوں سے زیادہ حرام سمجھتے ہیں؟

ایسا کیوں ہے کہ اسلام شراب کی حرمت سے شروع ہوتا ہے اور عورتوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگانے پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے؟ (احسان)

جواب: قرآن مجید نے حلت و حرمت کے حوالے سے جو اصولی بات کی ہے، وہ درج ذیل ہے۔ ارشاد باری

ہے:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ. (المائدہ ۵:۴)

''وہ پوچھتے ہیں: ان کے لیے کیا چیز حلال ٹھہرائی گئی ہے۔ کہو تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ٹھہرائی گئی ہیں۔''

یہود و نصاریٰ نے حلت و حرمت کے حوالے سے افراط و تفریط کا رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انھیں ایمان کی دعوت دیتے ہوئے، حلت و حرمت کے بارے میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا:

وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ، وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ، وَ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ، وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ. (الاعراف ۷:۱۵۷)

''(یہ پیغمبر) اُن کے لیے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام ٹھہرایا ہے اور اُن کے وہ بوجھ اتارتا اور بندشیں توڑتا ہے جو اب تک ان پر رہی ہیں۔''

اصل بات یہ ہے کہ دین چونکہ نفس انسانی کا تزکیہ کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ باطن کی تطہیر کے ساتھ کھانے اور پینے کی چیزوں میں بھی خبیث وطیب کا فرق ملحوظ رکھا جائے۔

اسلام میں شراب کی ممانعت کا حکم اسی بنا پر ہے کہ یہ چیز طیبات میں نہیں آتی، بلکہ یہ خبائث میں آتی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا، اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ، فَاجْتَنِبُوْہُ، لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (المائدہ ۵:۹۰)

''ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور تھان اور قسمت کے تیر، سب گندے شیطانی کام ہیں، اس لیے ان سے الگ رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

چنانچہ آپ کا یہ کہنا کہ بس شراب سے بچنے کا کہا گیا ہے، اسے حرام تو نہیں ٹھہرایا گیا، یہ بات درست نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ صرف طیبات ہی حلال ہیں اور شراب طیبات میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک گندہ شیطانی کام ہے، چنانچہ اس کے پینے پلانے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر صاحب ایمان کو اس سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ ''اسلام شراب کی حرمت سے شروع ہوتا ہے اور عورتوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگانے پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے'' یہ کسی حقیقت ناشناس اور لاابالی شخص ہی کا جملہ ہوسکتا ہے۔ ایسے شخص سے یہی گزارش کی جا سکتی ہے کہ اگر اسے اس طرح کے جملے کہنے کا محض شوق ہے تو وہ ضرور کہا کرے، بس یہ ذہن میں رکھے کہ اللہ نے ہر بات کا حساب لینا ہے، لیکن اگر اس کے دل میں حقیقت جاننے کا شوق ہے تو پھر وہ اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرے، ان شاءاللہ

اس کا یہ خیال بدل جائے گا۔

مزار پر دعا

سوال: ہمیں بزرگوں کے مزاروں پر جا کر کیا کہنا چاہیے اور کس طرح سے دعا کرنی چاہیے؟ (قاسم چٹھہ)

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں کسی بزرگ کے مزار پر کسی مشرکانہ عقیدے کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہیے، ورنہ ہم اپنے عقیدے ہی کی خرابی کی بنا پر خدا کے ہاں سخت سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔ مشرکانہ عقیدے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی کسی قبر والے بزرگ کے بارے میں کوئی ایسا خیال رکھے جس کی بنیاد قرآن وسنت میں موجود نہ ہو۔ مثلاً، یہ کہ ان سے دعا مانگی جا سکتی ہے، یہ حاجتیں پوری کرتے ہیں، یہ بگڑی بنا دیتے ہیں، ان سے مدد لی جا سکتی ہے، یہ ہمارے حالات سے واقف ہو جاتے ہیں، ہم جہاں کہیں سے انھیں پکاریں، یہ ہماری پکار سن لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دوسری بات یہ ہے کہ بزرگوں کی قبر پر جا کر خدا سے ان کی مغفرت اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کرنی چاہیے۔

بنک کی ملازمت

سوال: کیا بنک کی ملازمت جائز ہے؟ (عقیل شاہد)

جواب: بنک ایک سودی ادارہ ہے۔ اس ادارے کے ملازمین دراصل اس کے سودی نظام ہی کے ایجنٹ یا کارندے کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دیتے اور اس کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اسلام میں سود کھانا اور کھلانا صریحاً حرام ہے۔ چنانچہ سودی ادارے کی خدمات بھی ناجائز کام ہیں اور ان کا معاوضہ بھی حرام ہے۔

کسی بڑے عذر اور مجبوری کے تحت تو ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لیے بنک میں ملازمت کر لے، لیکن یہ ملازمت اصلاً جائز نہیں ہے۔

نظر بد

سوال: نظر بد کی کیا حقیقت ہے؟ لوگ اس کے علاج کے لیے سرخ مرچوں کو جلا کر مریض کو سنگھاتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ (سائرہ ناہید)

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'ان العین حق'، ''بے شک نظر کا لگ جانا سچ ہے۔'' (بخاری، رقم ۵۷۴۰، ۵۹۴۴؛ مسلم، رقم ۲۱۸۷، ۲۱۸۸)

نظر بد کیا چیز ہے؟

یہ غالباً بعض کیفیتوں میں انسان کی آنکھ سے نکلنے والے وہ اثرات ہیں جو دوسرے شخص پر خدا کے اذن سے اثر انداز ہوتے اور اسے بیمار وغیرہ کر دیتے ہیں۔ ان اثرات کا معاملہ بالکل وہی ہے جو عام انسانی اقدامات کا معاملہ ہوتا ہے، جیسا کہ ایک آدمی (خدا کے قانون کے تحت) دوسرے کو پتھر مار کر زخمی کر سکتا ہے، اسی طرح بعض لوگوں کی نظر بھی خدا ہی کے اذن سے دوسرے پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ نظر مؤثر بالذات ہرگز نہیں ہوتی جو کچھ ہوتا ہے، خدا کے قانون ہی کے تحت ہوتا ہے۔

نظر اگر لگ گئی ہو تو اس کو اتارنے کے لیے لوگوں نے مختلف حل تلاش کیے ہیں، سرخ مرچوں کو جلا کر سنگھانا، انھی میں سے ایک ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نظر اتارنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس آدمی کی نظر لگی تھی، اس کے وضو کا مستعمل پانی نظر کے مریض پر ڈالا۔

ہمارا خیال ہے کہ نظر بد کے اثرات جو کہ شاید نفسیاتی ہوتے ہیں یا کسی اور طرح کے غیر مادی اثرات ہوتے ہیں، انھیں دور کرنے کے لیے یہ طریقے لوگوں نے اپنے تجربات سے ایجاد کیے ہیں، ان میں اگر کوئی مشرکانہ بات نہ ہو تو انھیں اختیار کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح عام بیماری میں ہم خدا سے شفا کے طالب ہوتے ہیں، کیونکہ شفا اسی کی طرف سے ملتی ہے، اسی طرح نظر بد سے شفا کے معاملے میں بھی دوا کے ساتھ اللہ ہی کی پناہ پکڑی جائے گی اور اسی سے دعا کی جائے گی۔

آیت کا صحیح ترجمہ

سوال: سورۂ آل عمران آیت ۳۰ کا صحیح ترجمہ کیا ہے؟ (سائرہ ناہید)

جواب: آیت اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا، وَّمَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ، تَوَدُّ لَوۡ اَنَّ بَیۡنَہَا وَبَیۡنَہٗۤ اَمَدًا بَعِیۡدًا، وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ، وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ. (آل عمران ۳:۳۰)

''جس دن ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی سامنے پائے گا اور اُس نے جو برائی کی ہوگی، اُسے بھی دیکھے گا، اُس دن وہ تمنا کرے گا کہ کاش، اُس کے اور اِس (دن) کے درمیان ایک مدت حائل ہو جاتی۔ (یہ اللہ کی نصیحت ہے) اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور (اِس لیے ڈراتا ہے کہ) اللہ اپنے بندوں کے لیے بڑا مہربان ہے۔''

میراث کا ایک قضیہ

سوال: ایک صاحب نے اپنے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس اپنی وفات کے بعد کیش کرانے کی اتھارٹی اپنے ایک قانونی وارث کو دے دی، جب ان کی وفات ہوئی تو ان صاحب نے ایک عرصہ تک وہ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس کیش نہیں کرائے۔ پھر عدالت نے ان ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس کو باقی جائداد میں شامل کرتے ہوئے، انھیں کیش کرانے کی اتھارٹی سب ورثا کو دے دی۔

سوال یہ ہے کہ ان سرٹیفکیٹس کی رقم کا اصل حق دار کون ہے، کیا وہی شخص جسے مرحوم نے خود نامزد کیا تھا اور اسے کیش کرانے کی اتھارٹی دی تھی یا پھر سبھی ورثا جنھیں اب عدالت نے حق دار قرار دے دیا ہے؟

(عبداللہ)

جواب: اس سوال میں موجود معلومات ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عدالت نے نامزد شخص (Nominee) کے حق میں یہ بات تسلیم نہیں کی کہ مرنے والے نے اسے ان ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس کا مالک بنا دیا تھا، بلکہ اس کے نزدیک اسے محض ان سرٹیفکیٹس کو کیش کرانے کا حق دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب عدالت نے سارے ورثا کو ان کا مالک

مانتے ہوئے، کیش کرانے کا حق سبھی کو دے دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہی بات صحیح ہے۔

مشرکانہ اعمال والے فرقوں میں شادی بیاہ کا مسئلہ

سوال: مسلمانوں کے جن فرقوں میں مشرکانہ اعمال وتصورات پائے جاتے ہیں، کیا ان میں شادی کرنا جائز ہے؟ (سلمان طاہر)

جواب: اسلام میں مسلمان مرد کی شادی، مشرک عورت سے اور مسلمان عورت کی شادی، مشرک مرد سے بالکل ممنوع ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ، وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ، وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ، وَلَاتُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا، وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ، وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ. (البقرہ ۲:۲۲۱)

''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور (یاد رکھو کہ) ایک مسلمان لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگر چہ وہ تمھیں کتنی ہی بھلی لگے۔ اور اپنی عورتیں مشرکین کے نکاح میں نہ دو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور (یاد رکھو کہ) ایک مسلمان غلام مشرک شریف زادے سے بہتر ہے، اگر چہ وہ تمھیں کتنا ہی بھلا لگے۔''

ان آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مرد جو دین توحید سے وابستہ ہے، وہ دین شرک سے وابستہ کسی عورت کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا اور نہ دین توحید سے وابستہ عورت کی شادی دین شرک سے وابستہ کسی مرد کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں کے سارے ہی گروہ یا فرقے دین توحید سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی ہم دین شرک سے وابستہ قرار نہیں دے سکتے۔ ان میں جو شرک نظر آتا ہے، وہ تاویل کا شرک ہے، یعنی جسے ہم مشرکانہ بات کہتے ہیں، وہ اسے توحید کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ خود جسے توحید کے خلاف سمجھتے ہیں، اس سے نفرت کرتے ہیں۔

اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟ اس کی رہنمائی ہمیں قرآن مجید سے ملتی ہے، ارشاد باری ہے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ ، اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ، مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ، وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ. (المائدہ۵:۵)

''اورتم سے پہلے کے اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی (حلال ہیں)، جب تم اُن کے مہر ادا کرو، اس شرط کے ساتھ کہ تم بھی پاک دامن رہنے والے ہو، نہ بدکاری کرنے والے اور نہ چوری چھپے آشنا بنانے والے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود ونصاریٰ اپنے علم اور عمل، دونوں میں شرک کی نجاست سے آلودہ تھے، لیکن چونکہ وہ اصلاً توحید ہی کو مانتے تھے، یعنی وہ خود کو توحید کے بجائے شرک سے منسوب کرنا ہرگز پسند نہ کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اتنی رعایت کی کہ ان کی پاک دامن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دے دی۔

یہ معاملہ ان اہل کتاب کا ہے جو نہ صرف علم وعمل کے اعتبار سے شرک میں ملوث تھے، بلکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان بھی نہیں رکھتے تھے، جبکہ مسلمانوں کے سبھی فرقے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کے ان فرقوں میں جنھیں ہم شرکیہ اعمال وتصورات میں ملوث دیکھتے ہیں، شادی کرنے میں قانوناً اور شرعاً کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

غیر زائرین حرم کی قربانی

سوال: زائرین حرم کے علاوہ عام مسلمان جو اپنے اپنے علاقوں میں قربانی کرتے ہیں، کیا ان کا یہ قربانی کرنا درست ہے، جیسا کہ پاکستان میں کی جاتی ہے؟ کیا پاکستان میں قربانی صحیح طریقے سے کی جارہی ہے؟ (محمد شاکر)

جواب: زائرین حرم کے علاوہ عام مسلمان جو اپنے اپنے علاقوں میں قربانی کرتے ہیں، ان کا یہ قربانی کرنا بالکل درست ہے۔ یہ قربانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔

عَنْ اَنَسٍ... وَضَحّٰی (النَّبِیُّ) بِالْمَدِیْنَةِ کَبْشَیْنِ اَمْلَحَیْنِ اَقْرَنَیْنِ مُخْتَصَرًا. (بخاری، رقم ۱۷۱۲)

''حضرت انس سے روایت ہے... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں دو سیاہی وسفیدی مائل رنگ کے، سینگوں

والے مینڈھوں کو پہلو کے بل لٹا کر، ان کی قربانی کی۔''

اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَۃِ عَشَرَ سِنِیْنَ یُضَحِّیْ.

(ترمذی، رقم ۱۵۰۷)

''(ہجرت کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دس سال رہے اور آپ (ہر سال) قربانی کرتے رہے۔''

پاکستان میں قربانی کا جو طریقہ رائج ہے، یہ عام طور پر احناف کے اصولوں کے مطابق ہے اور اس میں اصولاً کوئی غلطی نہیں ہے۔
